مکتوباتِ نیاز کتابی صورت میں

بہت جلد شائع ہوں گے۔ کتابت شروع ہوگئی ہے۔ شائع شدہ مکتوبات کے علاوہ اور بہت سے مکتوبات اس میں ہوں گے کتابت و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے اور کاغذ بھی بہت دبیز استعمال ہوگا۔ قیمت ۸ر۔ لیکن جو حضرات عہ پیشگی بھیجدیں گے ان سے اور کچھ نہ لیا جائے گا۔

نیجر نگار

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ)
ششماہی تین روپیہ (سےر)

نگار

بیرون ہند سے آٹھ روپیہ (ہشے)
سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۶	فہرست مضامین اگست ۱۹۳۴ء	شمارہ ۲

ملاحظات ــــــــ ۲
زندگی کی عجیب و غریب داستان ــــــــ ۹
خدا کی جستجو میں ایک زنگی لڑکی کے تجربات ــــــــ ۱۳
افسانہ نہیں حقیقت ــــــــ محمد اسلام اللہ ــــــــ ۲۷
عالم گیر مذہب کی ضرورت ــــــــ م ۔ ر ۔ غ ــــــــ ۴۶
مکتوبات نیاز ــــــــ ۴۸
کسبی ــــــــ سید ابو سعید بزمی۔ بھوپالی بی ۔ اے ــــــــ ۵۳
یہ یونیورسٹیاں ــــــــ عبد الوالی بی ۔ اے ــــــــ ۶۳
باب المراسلۃ والمناظرہ ــــــــ ۶۷
باب الاستفسار ــــــــ ۷۱
منظومات ــــــــ ضیا ۔ نظیر ۔ مخدوم ۔ عدم ــــــــ ۷۴-۷۷

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

شمارہ ۲	اگست ۱۹۳۴ء	جلد ۲۶

ملاحظات

مرغابی شو کہ کار با طوفان ست

چند سال سے امریکہ میں بہائی مذہب کے تبعین کا ایک ادارہ "دی نیو ہسٹری سوسائٹی" کے نام سے قائم ہے اور وہ اپنے مقاصد میں بین الاقوامی اہلیت پیدا کرنے کے لئے ہر سال کسی نہ کسی موضوع پر تمام دنیا کے صاحب فکر و اہلِ قلم نوجوانوں کو اظہار خیال کی دعوت دیکر انعامات تقسیم کیا کرتی ہے[1]

---

[1] اس سوسائٹی کی طرف سے جو اعلان شائع ہوا ہے اس کا ترجمہ جناب خان بہادر صاحبزادہ سرفراز علی خاں صاحب چیف سکرٹری دربار جاورہ نے اُردو میں کردیا ہے اور میں انکا از بس شکر گزار ہوں کہ اس طرف سب سے پہلے مجھے صاحبزادہ صاحب موصوف نے توجہ دلائی، جو اسوقت نہایت ہی روشن خیال خوش فکر اور سنجیدہ اہم و تدبر رکھنے والے امراء میں سے ہیں۔ جو حضرات اس اعلان کا مطالعہ کرنا چاہیں وہ صاحب موصوف سے طلب کرسکتے ہیں۔ (اڈیٹر)

پہلے مقابلہ کا موضوع یہ تھا کہ:۔

"اعلیٰ مدارس کن طریقوں سے دُنیا میں صلح و آشتی کے خیال کو ترقی دے سکتے ہیں"

یہ موضوع صرف امریکہ کی یونیورسٹیوں کے طلبہ کے لئے مخصوص تھا جس میں وہاں کے ۱۷۲ طلبہ نے دلچسپی کا اظہار کیا دوسرے مقابلہ کا موضوع یہ تھا:۔

"یونیورسٹیوں کے طلبہ کیونکر تمام دنیا میں ایک انسانی سلطنت قایم کرنے میں مدد کر سکتے ہیں"

اس مقابلہ میں تمام یوروپ کے طلبہ کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی اور ۴۰۰ مضامین اس موضوع پر موصول ہوئے تھے۔

اب ۳۲ء کے لئے جو مقابلہ تجویز ہوا ہے اس میں ایشیا کے تمام نوجوانوں کو دعوت شرکت دی گئی ہے اور موضوع مکمل یہ ہے کہ:۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ دُنیا میں صرف ایک عالمگیر مذہب قایم کیا جائے اور اس باب میں ایشیا کے نوجوان کیا خدمت انجام دے سکتے ہیں"

یہ مقابلہ گزشتہ جولائی کو ہونے والا تھا اور جو مضامین قابل انعام قرار پائے ہوں گے انھیں انعام بھی مل چکا ہوگا، اسلئے اب میرا اس مسئلہ پر گفتگو کرنا اس لئے نہیں ہے کہ ہندوستان کے نوجوانوں کو اس موضوع پر لکھنے کی ترغیب دوں، بلکہ مقصود یہ بتانا ہے کہ اس وقت دنیا میں، قدیم مذہبی اداروں کی طرف سے کسقدر بے چینی پھیل رہی ہے اور نوع انسانی کا یہ اضطراب تدریجی طور پر کیا صورت اختیار کرنے والا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ امریکہ کی اس سوسائٹی کا قیام محض بہائی مذہب کی تبلیغ کے لئے ہو، ممکن ہے کہ اس نوع کے نشر و اعلان میں درپردہ کوئی مذہبی تنگ نظری بھی شامل ہو لیکن ہمیں اس سے بحث نہیں ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ اب مذہب کا جدید نظریہ کن اُصول پر قایم کیا جا رہا ہے اور اختلاف مذاہب کی وجہ سے جو شورش و بدامنی، جو قتل و خونریزی اس وقت تک ہوئی اور ہو رہی ہے، اس کے انسداد کی طرف کیونکر آہستہ آہستہ طبائع انسانی مایل ہوتی جا رہی ہیں اور غالباً وہ وقت دور نہیں جب یا تو کوئی ایسا زبردست پیغمبر رونما ہو جو اختلافات مذہبی مٹا کر سب کو ایک دین و مسلک سے وابستہ کر دے (جو تقریباً محال ہے) یا پھر کرۂ ارض سے مذہب کا خیال ہی یکسر محو ہو جائے (جو بالکل قرین قیاس ہے)۔

تاریخ تمدن انسانی پر جس وقت غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر طلوع آفتاب کے ساتھ انسان کا قدم ترقی کی طرف اُٹھ رہا ہے اور عقاید مذہبی کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے، اس لئے یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہب ترقی کے منافی ہے، کیا اس کے اُصول انسان کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں اور کیا مذہبی تعلیم دماغی نشوونما اور ذہنی ارتقا کو ... دینے سے عاری ہے

اس کا جواب ڈھونڈھنے کے لئے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں، مذاہب عالم کی تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو آپ کو خود معلوم

ہو جائے گا کہ یقیناً مذہب انسان کی ترقی میں حائل ہوا اور اسے حایل ہونا چاہئے تھا کیونکہ مذاہب عالم کی پیداوار نتیجہ تھا صرف مقامی و نسلی اقتضاء کا اور اس کے ذہن میں تمام نوع انسانی کی فلاح و ترقی کا سوال آ ہی نہ سکتا تھا، اگر کوئی مذہب ایشیاء کے مغرب میں پیدا ہوا تو اسے مشرق کے باشندوں کا حال معلوم نہ تھا اور اگر مشرق میں اس کا نشو و نما ہوا تو وہ اہل مغرب کے طرف سے خالی الذہن تھا، صرف ایک مخصوص جماعت، ایک محدود ملک کی اصلاح کا مقصد اُن کے سامنے ہوتا تھا اور اس لئے قدرتاً وہ ایسے اُصول بنا ہی نہ سکتے تھے جو کرۂ ارض کے تمام باشندوں کے لئے اُن کے ماحول، ان کی معاشرت اور اُن کی طبیعت و مزاج کے لحاظ سے مناسب و ضروری ہوں — میری مراد مذہب سے یہاں نہ صرف وہ چند معتقدات ہیں جن کا تعلق صرف خدا کی ہستی یا مابعد الطبیعیات سے ہے، بلکہ اس شریعت یا اُصول اخلاق و معاشرت سے بھی ہے جو ایک مذہب کے ماتحت کسی قوم میں رائج ہو جاتے ہیں اور جن کا اختلاف اُصولی اختلاف قرار دیا جا کر باہم کُشت و خون کا باعث ہوا کرتا ہے۔

دُنیا میں سب سے آخری قابل ذکر مذہب، اسلام ہوا ہے، جسکے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مذاہب کی دُنیا میں آخری لفظ کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ نہ اپنے معتقدات دینی کے لحاظ سے وہ سب کے لئے قابل قبول ہے اور نہ شریعت کے اعتبار سے وہ مکمل کہا جا سکتا ہے۔

Is there any proof ?

اس میں شک نہیں کہ دُنیا میں جتنے انبیاء ظاہر ہوئے اُن سب نے یہی کہا کہ وہ نوع انسانی کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے ہیں، لیکن علاوہ اس سے زیادہ کامیاب نہ ہوئے کہ ایک محدود جماعت و مخصوص ملک میں کچھ زمانہ تک تو بیداری ضرور پیدا رہی لیکن پھر رفتہ رفتہ وہ فنا بھی ہو گئی۔ اس کا سبب صرف یہی تھا کہ زمانہ کی ترقی کا ساتھ کوئی مذہب نہ دے سکا اور انسان کے ذہن و عقل میں جو نشو و نما پیدا ہو رہا ہے اس کے اقتضاء کو وہ پورا نہ کر سکا۔

مذہب نام نہ صرف خالص اصلاح اخلاق کا ہے اور نہ ترقی تمدن و معاشرت کا بلکہ اس میں وہ اعتقادات بھی شامل ہیں جو خدا کی ہستی اس کی عبادت اور حیات بعد الموت سے بھی متعلق ہیں، اور اس لئے ایک مذہب صرف ہمارے اصول معاشرت و اخلاق منضبط کرنے کا مدعی نہیں ہے بلکہ وہ انسان کو اس بات پر بھی مجبور کرتا ہے کہ خدا اور اس کی ہستی کی نسبت، بعض متعین و مخصوص عقائد کو تسلیم کرے۔ یعنی وہ عقل انسانی پر بھی حکمرانی کرنے کا دعویدار ہے، درآنحالیکہ عقول انسانی میں جو تدریجی ارتقاء پیدا ہو رہا ہے اس کا ساتھ دینے کی اہلیت اس میں نہیں ہے — اور غالباً یہی وجہ ہے جس کی بناء پر بار بار یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ مذہب میں عقل کو کوئی دخل نہیں ہے۔

ایک طرف تو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ مذہب فطری چیز ہے، یعنی عقل انسانی خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے، مذہب کے اصول و عقاید متزلزل نہیں ہو سکتے، اور دوسری طرف یہ تاکید بھی ہے کہ مذہب نام ہے بغیر استعمال عقل کے اُن تمام باتوں کو چون و چرا تسلیم کر لینے کا جنکو ہمارے اکابر و اسلاف تسلیم کرتے چلے آئے ہیں اور ان دونوں میں جو تضاد و تباین پایا جاتا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں کہ مذہب بالکل مقامی و زمانی چیز ہے یعنی ایک مخصوص قوم و ملک کے مفاد کو سامنے رکھ کر وضع

کیا جاتا ہے، اور اس کا قوی ترین ثبوت یہ ہے کہ دنیا میں ہر مذہب سوائے اپنے دوسرے کو باطل قرار دیتا ہے، یعنی وہ اپنے متبعین میں دوسری اقوام یا دیگر مذاہب والوں سے نفرت کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں عالم کا امن و سکون اس سے کسی طرح وابستہ نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے برعکس وہ باہمی اختلاف و تصادم پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔

ہر چند مذہب کی اس حقیقت کا انکشاف کوئی جدید انکشاف نہیں ہے، اور اس سے قبل بھی اس تلخی کا علم لوگوں کو حاصل تھا لیکن چونکہ ترقی تمدن اس حد تک نہ ہوئی تھی کہ تمام کرۂ ارض کے امن و سکون اور جملہ نوع انسانی کی مرکزیت کی طرف خیال منجر ہوتا اس لئے چنداں پرواہ بھی نہ کی جاتی تھی، لیکن اب کہ علمی اکتشافات، ذرائع نقل و حمل، اور تجارتی و اقتصادی وسعت نے دنیا کے ہر ملک کو دوسرے ملک کا محتاج بنا دیا ہے، سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ دنیا کا امن و سکون کیونکر قایم رکھا جائے اور باہمی جذبات مخالفت و منافرت کو دور کر کے کسی طرح تمام نوع انسانی کو ایک شیرازہ سے وابستہ کر دیا جائے۔

یقیناً مذہب اس مقصد کو پورا کر سکتا تھا اگر اس کے عقاید و قانون میں اتنی لچک ہوتی کہ وہ ذہن انسانی کی ترقی کا ساتھ دے سکتا، لیکن چونکہ مذہب نام ہے صرف قدامت پرستی کا اور انھیں اصول پر کاربند ہونے کا جو صدیوں اور ہزاروں سال قبل وضع کئے گئے تھے، اس لئے وہ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں ہو سکتا، اور ایک مذہب پر کیا موقوف ہے اس وقت کوئی نظام عمل جو ذہن انسانی کی تشویش کو دور کرنے اور دنیا میں عام امن و سکون پیدا کرنے کے ناقابل ہے، کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اب اسی کے ساتھ ایک اور سوال بھی غور طلب ہے، یعنی یہ کہ اگر آج دنیا سے مذہبیت یکسر فنا ہو جائے اور مذہبی عصبیت بالکل محو کر دی جائے تو کیا مدعا حاصل ہو جائے گا، اور کیا کرۂ ارض کے تمام باشندے ایک دوسرے کے ساتھ بھائی بنکر رہنے لگیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً مدعا اس وقت بھی حاصل نہ ہوگا، کیونکہ مذہبیت کے علاوہ دو بلائیں اور نوع انسانی پر نازل ہوئی ہیں، ایک امتیاز رنگ و نسل کی اور دوسری جذبۂ سرمایہ داری کی، یعنی جس طرح مذہب لوگوں میں جذبۂ منافرت کی پرورش کر رہا ہے بالکل اس طرح گورے کالے کے امتیاز اور فراہمی دولت کی حرص نے انسانیت کو پامال کر رکھا ہے، چنانچہ امریکہ میں جو سلوک حبشیوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں اور سرمایہ داروں کے طرف سے مزدوروں کی محنت و عرقریزی کا جو صلہ ملتا ہے وہ بھی دنیا کو معلوم ہے۔ وہ اہل نظر جن کی نگاہ ان تمام مسائل پر ہے، ان میں سے بعض کا خیال یہ ہے کہ رنگ و نسل کا امتیاز بھی مذہب ہی نے پیدا کیا ہے اور سرمایہ دارانہ ذہنیت بھی نتیجہ ہے مذہبیت کا جس نے اخلاق کی آڑ میں سلطنت و حکومت کی بنیادیں قایم کیں۔ اس لئے مذہبیت کے ساتھ ان کو بھی ختم ہو جانا ہے، اگر میں اس سے متفق نہیں ہوں اور ان کو جداگانہ امراض تصور کرتا ہوں جن کا علاج بھی بالکل جداگانہ ہونا چاہئے۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ جب تک کلیتہً تمام امراض کے دور کرنے کی صورتیں نہ پیدا ہو جائیں، کسی ایک مرض کا بھی مداوا نہ کیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک کا انداز دوسری بیماریوں کا مقابلہ کرنے کی اہلیت ہم میں پیدا کر دے اور اس لئے اگر دنیا سب سے پہلے مذہبیت ہی کو دور کرنا چاہتی ہے تو بیجا نہیں جبکہ حقیقتاً سب سے زیادہ سخت و سنگین مرض یہی ہے۔

اس کے متعلق دنیا میں فی الحال دو قسم کا خیال رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں، ایک وہ جو موجودہ مذاہب میں اصلاح کر کے کسی ایک عالمگیر مذہب کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں اور دوسرے وہ جو سرے سے مذہب کے خیال ہی کو محو کر دینا پسند کرتے ہیں۔

ان میں اول الذکر صورت یقیناً بہتر ہے لیکن تقریباً ناممکن العمل، دوسری صورت البتہ زیادہ آسان ہے اور لوگوں کے موجودہ رجحان کو دیکھتے ہوئے یقین کرنا پڑتا ہے کہ چند صدی کے بعد مذہب تو یقیناً ختم ہو ہی جائے گا، گو سرمایہ و عمل کی جنگ اور رنگ و نسل کا امتیاز علی حالہٖ قائم رہے۔

پھر جب آثار یہ ہیں اور حالات کی نزاکت اس حد تک پہونچ گئی ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان جو اختلافات مذہب کے لحاظ سے دُنیا کا حد درجہ بدنصیب ملک ہے، کیا کرنا چاہتا ہے اور اس کے اندر رہنے والوں نے اپنے وطن کو غلامی، ذلت، پستی و نکبت سے نکالنے کی کیا تدبیریں سوچی ہیں — اس سے یقیناً انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک ملک کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا حق جو اس کے فرزندوں پر عاید ہوتا ہے، یہ ہے کہ وہ اس کو کسی اور کی غلامی میں نہ دیں، یعنی ایک ملک و قوم کا تنہا طرۂ تفخر و امتیاز صرف یہ ہے کہ اس کی گردن جھکی ہوئی نہیں ہے اور اس کی دولت پر دوسروں کا قبضہ نہیں ہے۔ لیکن یہ اسوقت ممکن ہے جب اس کے تمام افراد کسی ایک غرض مشترک سے وابستہ ہوں، ایک مرکز پر مجتمع ہوں اور صرف ایک ہی نصب العین کی طرف ان کے متفقہ قدم اُٹھتے ہوں۔ پھر کس قدر بدنصیب ہے وہ ملک جس کے فرزند ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں، صرف اسلئے کہ ان میں سے ایک مسجد میں جاکر عبادت کرتا ہے اور دوسرا مندر میں، ایک کے ہاتھ میں تسبیح ہے اور دوسرے کے گلے میں زنار۔

دُنیا میں اور بہت سے ملک ہیں، لیکن اس باب میں ہندوستان سے زیادہ بدبخت کوئی نہیں اور مذہب و مذہبیت کا استعمال جس بُری طرح یہاں کے لوگوں نے کیا ہے، اس کی مثال اسوقت روئے زمین کے کسی حصہ میں نہیں مل سکتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس طرف توجہ کون کرے۔ پنڈتوں اور مولویوں کی وہ جماعت جس کے وجود نے یہاں کی فضا کو اسقدر گندہ کر رکھا ہے؟ تو کیا ہماری موجودہ نسل کے وہ نوجوان جو مغربی علوم سیکھنے کے بعد اپنے آپ کو روشن خیال اور آزاد طبع کہلانا پسند کرتے ہیں؟

اس کے متعلق اسی اشاعت میں یونیورسٹیوں والا مضمون پڑھکر خود فیصلہ کیجئے کہ اب قسمت آزمائی کی صورت کیا باقی رہگئی ہے۔

عبدالوالی صاحب بی۔ اے اپنی ایک تحریر میں مجھے لکھتے ہیں:-

"نیاز صاحب، یہ انگریزی تعلیم یافتہ جماعت بہت زیادہ توجہ کے قابل ہے، مذہب اور مولویوں کو چھوڑ کے اس بدمذاق جماعت کی طرف متوجہ ہوجئے۔ ان کمبختوں کو فخر ہے کہ اُردو سے بے نیاز ہیں، دنیا میں یہ ایسی قوم ہو جو ہر چیز جاننے کی دعویدار ہے سوائے اپنی مادری زبان کے — مذہب تو اپنی موت آپ مر رہا ہے، مرے کو مارنے میں کیا رکھا ہے — ذرا مذہبازی تو ان بے حسی اور بدمذاقی کے تودوں پر کیجئے جو اپنے آپ کو یونیورسٹیوں ... تعلیم یافتہ کہتے ہیں اور ... باوجود ذہنی کام کرنے کے اسدرجہ غیر ذہنی زندگی رکھتے ہیں — بالکل ڈفالیوں کی سی

ان کی حالت ہے کہ عمر بھر گایا بجایا مگر گانا نہ آیا ——"

میں اس باب میں عبدالوالی صاحب سے بالکل متفق ہوں اور میری نگاہ سے اس جدید تعلیم یافتہ جماعت کی قابلیت اور صحت دماغی کے ایسی ایسی عجیب مثالیں گزری ہیں کہ اگر ان کا اظہار کروں تو کوئی باور نہ کرے، لیکن ہم کو اگر ان سے کوئی شکایت ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ انھیں قوم کا درد نہیں ہے، ملک کی محبت سے اُن کے سینے خالی ہیں اور علم کی صحیح روشنی سے اُن کے قلب معمور نہیں، لیکن قائدین مذہب تو ملک و قوم کے دشمن ہیں، انسانیت و اخلاق کے ابولہب ہیں اور اپنی پیٹ کی دوزخ میں ملک و ملت سب کچھ جھونکدینا چاہتے ہیں۔

آج اگر نوجوانوں کی تعلیم یافتہ جماعت اصلاح قوم کا جذبہ لیکر آمادۂ کار ہو بھی جائیں تو سب سے پہلے انھیں وہی کام کرنا پڑیگا جو میں کر رہا ہوں، کیونکہ جب تک آپ راہ سے سنگ گراں کو نہ ہٹا دیں راستہ کیونکر طے ہو سکتا ہے۔

اصلاح خواص سے شروع ہوتی ہے یا عوام سے، یہ مختلف فیہ مسئلہ ہے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ جب تک عوام میں بیداری پیدا نہ ہو اور پبلک کی اصلاح نہ ہو ہیئت اجتماعی کی تشکیل دشوار ہے۔ پھر غور کیجیے کہ عوام کا کیا حال ہے اور ان پر کس کا اثر غالب ہے؟ اگر ہندوستان کی تمام یونیورسیٹیوں کے طلبہ جدید تہذیب و ترقی کے تمام نظریوں سے آراستہ ہو کر اصلاح ملک کے لئے آمادہ ہو جائیں، تو بھی مولوی کے اُس ایک منتر کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو وہ ملک کی جاہل آبادی پر کسی واقعۂ معجزہ و کرامات کی صورت میں پڑھکر پھونک دے گا۔ عوام کی اس کورانہ ذہنیت کا بدلدینا جو صدیوں سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی آرہی ہے آسان کام نہیں۔ اس کے لئے یا تو ایسی حکومت ہونی چاہئے جو بزور شمشیر اس تمام فاسد مواد کو دور کردے، جیسا کہ ترکی میں مصطفےٰ کمال یا ایران میں رضا شاہ پہلوی نے کیا، یا پھر تعلیم اتنی عام اور صحیح ہونی چاہئے کہ پبلک خود دوست دشمن میں تمیز کر سکے جو یقیناً صدیوں کا کام ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اصلاح کے سلسلہ میں تعمیری اور تخریبی دونوں پہلو سامنے آتے ہیں اور عام طور پر تعمیری پروگرام بنانا ہی زیادہ پسند کیا جاتا ہے، حالانکہ اُصولاً سب سے پہلے تخریبی فرائض سے سبکدوش ہونا ضروری ہے۔

اگر کوئی عمارت اس حد تک شکستہ و خراب ہو جائے کہ معمولی مرمت اس کے لئے کافی نہ ہو، تو اس کا گرادینا ضروری ہے اور جب تک اس کو پہلے زمین کے برابر نہ کر دیا جائے اس پر دوسری عمارت قایم نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کی تنظیمی حالت کا بھی بالکل یہی حال ہے کہ اس کے اصلاح کیلئے فی الحال تعمیری پروگرام پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک پہلے اس سبب کو نہ محو کر دیا جائے جس نے اس کی بنیاد کو متزلزل کر رکھا ہے اور یہ سبب مذہبیت کا وہ غلط مفہوم ہے جسے مولویوں اور پنڈتوں نے پیدا کیا اور جو ان کے فنا ہونے کے بعد ہی دور ہو سکتا ہے۔

دُنیا میں جسمانی غلامی کو بہت بُرا سمجھا جاتا ہے، درآنحالیکہ جسمانی غلامی نتیجہ ہے، ذہنی غلامی کا اس لئے ضرورت تو سب سے پہلے ذہنی غلامی کو دور کرنے کی ہے اور غالباً اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مذہبی عصبیت سے زیادہ ذہنی غلامی پیدا کرنیوالی

کوئی چیز نہیں۔

اس وقت زمانہ میں علم و عقل کا ایک طوفان برپا ہے، مادی ترقی کا سیلاب موجیں مارتا چلا آرہا ہے اور اس لئے اب اگر کوئی بات منھ سے نکالنے کی ہے تو صرف یہ کہ "مرغابی شو کہ کار با طوفان ست"۔

پھر اگر دنیا کا کوئی مذہب ایسا ہے جو ہماری نجات کا ذمہ دار ہو سکتا ہے تو سامنے آئے اور ہمیں اپنی دوش پر بٹھا کر ساحل تک پہونچا دے، ورنہ خس و خاشاک کی طرح اس کا بہہ جانا بھی یقینی ہے، خواہ وہ آج ہو یا کل۔

اسی ماہ کی اشاعت میں کسی جگہ آپ کو منیجر کا اعلان نظر آئے گا کہ "مجموعۂ استفسار و جواب" چھپ کر طیار ہو گیا ہے۔ وہ حضرات جو "نگار" کا مطالعہ ابتدا سے کر رہے ہیں، اُن سے یہ امر مخفی نہ ہوگا کہ اسوقت تک کتنے اہم مسائل پر بہ سلسلۂ استفسارات بحث ہو چکی ہے، اور جو حال کے خریدار ہیں وہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ اس سے قبل کیا کچھ نہ اس سلسلہ میں لکھا گیا ہوگا پہلے سنہ ۲۲ء سے اس وقت تک کے تمام استفسار و جواب کو یکجا شائع کرنے کا ارادہ تھا، لیکن کتابت کے بعد معلوم ہوا کہ حجم ۱۵۰۰ صفحات سے زاید ہو جائے گا اور اس لئے اس کے تین حصے کر دینا مناسب ہے، چنانچہ پہلا حصہ جس میں مختلف علمی، ادبی، مذہبی و تاریخی مباحث پر گفتگو کی گئی ہے، ۵۱۲ صفحات پر شایع کیا گیا ہے، اس کی قیمت مع محصول [illegible] مقرر کی گئی ہے لیکن خریداران نگار کے لئے ایک روپیہ کی رعایت ملحوظ رہے گی۔ جن حضرات نے پیشگی قیمت بھیجدی تھی ان کی خدمت میں مجموعہ روانہ کیا جا رہا ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ نہ صرف تمام خریداران نگار کے لائبریریوں میں پایا جائے گا بلکہ وہ اپنے احباب کو بھی اسکی اہمیت پر روشنی ڈالکر خریداری کی طرف مائل کریں گے۔ اگر نگار کی اعانت آپ کے نزدیک ضروری ہے تو امداد کی بہترین صورت یہی ہے کہ اس کی مطبوعات کو خود بھی خریدیں اور اپنے حلقۂ تعارف میں بھی مقبول بنانے کی کوشش کریں۔ یہ معاملہ نہ گدائی کا ہے نہ احسان کا بلکہ ایک سودا ہے جس میں آپ ایک چیز خریدتے ہیں اور میں فروخت کرتا ہوں، پھر اگر آپ [illegible] خرچ کرکے کوئی ایسی چیز حاصل کر رہے ہیں جو ہمیشہ آپ کے کام آنے والی ہے تو کیا یہ سودا آپ کے نزدیک بُرا ہے۔

جنوری سنہ ۴۴ء کے رسالہ کے لئے جن حضرات نے لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے یا جو اصحاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں اُن کی خدمت میں التماس ہے کہ جسقدر جلد اُن کا مضمون موصول ہوگا اتنی ہی آسانی ترتیب میں ہوگی، اور اتنی ہی بہتر جگہ انکے مقالہ کو مل سکیگی۔

تذکرۂ معرکۂ سخن

اردو زبان میں اپنی نوعیت کا پہلا تذکرہ نگار سائز کے ۲۸۰ صفحات پر شائع ہو گیا۔ مفصل اشتہار صفحہ ۷۶ پر ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت [illegible] منیجر نگار

زندگی کی عجیب و غریب داستان

کرۂ زمین جس پر انسان آباد ہے ایسا حقیر و ذلیل کرہ ہے کہ اس وقت تک گنتی کے صرف چند ایسے سیارے دریافت ہوئے ہیں جو ہماری زمین سے چھوٹے ہیں، ورنہ باقی سب اس کے مقابلہ میں اتنے بڑے ہیں کہ اگر لاکھوں زمینیں ان کے اندر ڈال دی جائیں تو بھی جگہ خالی رہے، اور بعض تو اتنے بڑے ہیں کہ کروڑ اندر کروڑ زمینیں بھی ان کا خلا پُر کرنے کے لئے کافی نہ ہوں

اگر کوئی سوال کرے کہ اس بسیط فضا میں کتنے ستارے پائے جاتے ہیں تو اس کا جواب وہی شخص دے سکتا ہے جو تمام دنیا کے ریگزاروں میں ذرات ریگ کا شمار کر سکے ——— یہ ہے کائنات کی عظمت اور یہ ہے ہمارے کرۂ ارض کی حقیقت اس کے مقابلہ میں

فضا میں جتنے تارے پائے جاتے ہیں ان میں سے بعض نے تو جھنڈ کی صورت اختیار کر لی ہے اور اکثر ایسے ہیں جو تنہا چکّر لگا رہے ہیں، لیکن باوجود ستاروں کی اتنی کثرت کے فضا کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ ان کا ایک دوسرے سے متصادم ہو جانے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے اور ہر ایک دوسرے سے اتنی دُور واقع ہے کہ ہم اس بعد کا اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔ اگر فضا کو آپ سمندر قرار دیں اور تاروں کو جہاز تو یوں سمجھئے کہ ان میں سے ہر جہاز اس طرح سفر کر رہا ہے کہ اس سے قریب ترین جہاز بھی لاکھوں میل کے فاصلہ سے کم نہیں ہے، اور ایک کا دوسرے کی کشش میں آجانا مستبعد ہے۔ لیکن اگر ایسا کبھی ہو جائے تو کیا ہو؟

کہا جاتا ہے کہ اب سے اربوں سال قبل ایک سیارہ، فضا میں آوارہ پھرتا ہوا ہمارے آفتاب کے قریب آگیا اور اس سے آفتاب کے مادہ میں بالکل ایسا ہی تلاطم پیدا ہوا جس طرح چاند اور سورج کی کشش سے زمین کے سمندر میں مد و جزر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے،

پھر ظاہر ہے کہ یہ زمین کے سمندروں کا تلاطم نہ تھا بلکہ آفتاب ایسے عظیم الشان کرہ کے مادہ کا ہیجان تھا جو جابجا عظیم الشان پہاڑوں کی صورت میں اُبھرنا شروع ہوا اور جب وہ سیارہ زیادہ قریب آگیا تو کشش کی زیادتی

سے آفتاب کے متلاطم مادوں کے اجزاء اس سے جدا ہوکر فضا میں چاروں طرف پھیل گئے اور گردش کرنے لگے، جو نظامِ شمسی کے سیارے کہلاتے ہیں اور جن میں سے ایک ہمارا کرۂ زمین بھی ہے

آفتاب اور دیگر سیارے جو ہمیں نظر آتے ہیں سخت گرم ہیں، اتنے گرم کہ ان میں کوئی ذی حیات زندہ نہیں رہ سکتا اور نہ کوئی جاندار چیز پیدا ہوسکتی ہے، اسی لئے سطح آفتاب سے جو اجزاء اس سے علیحدہ ہوکر گردش میں آگئے تھے وہ بھی عدد درجہ گرم تھے، لیکن رفتہ رفتہ وہ سرد ہونے لگے، یہاں تک کہ ان میں سے ایک دگر یہ نہیں معلوم کہ کب اور کیونکر) اس قابل ہوسکا کہ اس میں آثار حیات پیدا ہوں۔ ہرچند ہم یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتے لیکن گمان غالب یہی ہے کہ انسان کا وجود بھی انھیں آثار میں سے بعض کا نتیجہ ہے، جو ایک خوردبینی ذرۂ ریگ پر کھڑا ہوا کائنات کے نسبط اور فضا کی لامحدود وسعت کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اور خوف سے کانپ اٹھتا ہے

یقیناً اس پر خوف کی کیفیت طاری ہونا چاہئے کیونکہ جس وقت وہ زمانہ کی ازلیت پر نگاہ ڈالتا ہے تو تاریخ انسانی کا تمام عہد اسے پلک مارنے سے زیادہ وسیع نظر نہیں آتا، اور کائنات میں اس کو اپنے کرہ کی اہمیت اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم ہوتی جیسے ریگزار عالم میں کسی ذرۂ ریگ کا لاکھواں حصہ —— علاوہ اس کے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ نظامِ عالم کو نہ اس کی زندگی کی پرواہ ہے، نہ اس کے جذبات کی پاسداری بلکہ ایک حد تک بے پروائی و دشمنی ہے تو اس کا خوف اور زیادہ بڑھ جاتا ہے

اس وسیع فضا کا اکثر حصہ اتنا سرد ہے کہ اس میں کسی کی زندگی قائم نہیں رہ سکتی اور مادہ کا اکثر حصہ اتنا گرم ہے کہ حیات کا بقا اس میں محال ہے، رات دن مہلک و مضرت رساں شعاعوں کے حملے ہوتے رہتے ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ کس وقت کس طرح نوع انسانی ختم ہوجائے

یہ ہے وہ کائنات جس کے اندر ہم رہ پڑے ہیں اور اگر یہ غلطی نہیں تھی تو اس کو سوائے اتفاق کے اور کیا کہہ سکتے ہیں

ہکسلے نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر چھ بندر ٹائپ رائٹر پر بٹھادیے جائیں اور وہ لاکھوں سال تک اس پر اپنی انگلیاں چلاتے رہیں تو یقیناً کہیں نہ کہیں شیکسپیر کی کوئی نظم ٹائپ کی ہوئی مل جائے گی، بالکل یہی حال فضا کے اندر کروروں ستاروں کا سمجھئے کہ وقت نامعلوم سے دوران گردش میں خدا جانے کن کن حوادث سے دوچار ہوتے چلے آتے ہیں اور اتفاق سے ان میں سے بعض کسی مرتب نظام سے وابستہ ہوگئے ہیں۔ لیکن جاندار چیزیں پیدا کرنے کی صلاحیت بہت کم ستاروں میں ہے کیونکہ اس کے لئے ایک خاص معتدل درجۂ حرارت کی ضرورت ہے اور وہاں یہ عالم ہے۔ کہ بعض سیارے بالکل آگ ہی آگ ہیں اور بعض برف ہی برف —— اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کائنات حقیقتاً جاندار پیدا کرنے کے لئے وجود میں نہیں آئی تھی ورنہ شروع ہی سے اس کی حرارت میں درجۂ اعتدال پیدا کیا جاتا اور اگر

کرۂ زمین میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی تو اس کو محض اتفاق سمجھنا چاہیئے نہ کہ مقصود آفرینش

ہم کو نہیں معلوم کہ صرف مناسب مادی حالات جاندار پیدا کرنے کے لئے کافی ہیں یا نہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ کرۂ زمین چونکہ آہستہ آہستہ سرد ہو رہا تھا اس لئے قدرتاً اس میں جاندار پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہونی چاہیئے تھی، بعض کہتے ہیں کہ جب زمین کسی ایک حادثہ یا اتفاق سے وجود میں آئی تھی تو لازم تھا کہ کوئی دوسرا اتفاق ایسا بھی پیدا ہوتا جو جاندار اشیاء کو وجود میں لاتا۔ کیونکہ وہ مادی اجزاء جو حیات کے لئے ضروری ہیں نہایت معمولی کیمیاوی اجزا ہیں (مثلاً کاربن جو کاجل میں پایا جاتا ہے، یا ہائڈروجن و آکسیجن جو پانی میں موجود ہے یا نائٹروجن جس سے فضا معمور ہے) اور یہ سب اجزاء کرۂ زمین میں پائے جاتے تھے، جن کے باہم ملنے جلنے سے اتفاقاً جاندار خلا یا وجود میں آگئے

لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی جاندار خلایا کا پیکر ہونا انھیں کیمیاوی اجزاء کے اختلاط و امتزاج کا نتیجہ ہے اور کیا کوئی ماہر علم الکیمیا انھیں اجزاء سے کوئی جاندار چیز پیدا کر سکتا ہے، اس کا جواب اس وقت تک نہیں دیا جا سکا

کہا جاتا ہے کہ ہائڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن اور کاربن کے اجزاء باہم مل کر گرداوں کی تعداد میں قالئ (Molecules) پیدا کرتے ہیں اور ان سے جاندار اشیاء وجود میں آتی ہیں

ایک صدی قبل تک عام طور پر یہ یقین کیا جاتا تھا کہ ان اجزاء میں زندگی قبول کرنے کی صلاحیت کسی اور قوت سے پیدا ہوتی ہے جس کا علم اب تک حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن اب علماء کا رجحان اس طرف ہے کہ کوئی اور قوت کام نہیں کرتی، بلکہ انھیں عناصر کے امتزاج سے یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے، جس میں بڑا حصہ کاربن کا ہے تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کاربن کا ہر ذرہ مرکب ہے ایک مرکزی حصہ سے جسے نواۃ (Nucleus) کہتے ہیں اور چھ برقپاروں (Electrons) سے جو اس مرکزی حصہ کے چاروں طرف گردش کرتے رہتے ہیں، گویا کاربن ہی اصل چیز ہے جس سے حیات پیدا ہوتی ہے —— ماہرین علم الکیمیا کا خیال ہے کہ مقناطیسیت کی طرح حیات بھی بالکل خود رو چیز ہے جس کو صرف اتفاق کا نتیجہ کہنا چاہیئے

بہرحال وہ کاربن کی مدد سے انسان پیدا ہوا ہو یا کسی اور سبب سے، یہ یقینی ہے کہ اس کے بقا کے لئے مناسب روشنی اور گرمی لازم ہے اور اگر کسی وقت کرۂ ارض کا وہ درجۂ حرارت جو بقاء حیات کے لئے ضروری ہے مفقود ہو گیا تو ہمارا فنا ہو جانا یقینی ہے خواہ وہ حرارت کے بڑھ جانے سے ہو یا اس کے مفقود ہو جانے سے

جس طرح عہد قدیم کا انسان جو زمین کے منطقۂ معتدلہ میں آباد تھا، برف کی بڑی بڑی چٹانوں کو اپنی وادی کے اندر آتے ہوئے دیکھ کر گھبراتا تھا۔ کہ کسی دن وہ برودت کی زیادتی سے ہلاک نہ ہو جائے، بالکل اسی طرح

آج کے انسان کو بھی ڈرنا چاہیئے کیونکہ جو اسباب اندیشہ کے اس وقت پائے جاتے تھے، اب بھی پائے جاتے ہیں بلکہ جوں جوں زمانہ زیادہ گزرتا جاتا ہے۔ یہ اسباب بھی زیادہ قوی ہوتے جاتے ہیں

زمین کو جتنی حرارت پہونچ رہی ہے وہ سب آفتاب کے طفیل میں ہے اس لئے ظاہر ہے کہ جب تک آفتاب اس خدمت کو انجام دے رہا ہے کرۂ ارض پر حیات بھی باقی ہے اور جس دن اس نے اس خدمت کو ترک کردیا، سب جاندار ہلاک ہو جائیں گے

پھر چونکہ آفتاب بھی ایک سیارہ ہے جو روز بروز اپنی حرارت کو کھوتا جارہا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ اسی نسبت سے زمین کو بھی کم گرمی پہونچے گی اور وہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے آفتاب سے قریب تر ہوتی جائے گی پھر اگر یہ اس قدر قریب ہو گئی کہ آفتاب نے اسے دفعتہً اپنے اندر کھینچ لیا تو گرمی کی شدت سے حیات فنا ہو جائے گی اور اگر کسی خاص حد تک پہونچ کر قائم ہو گئی تو پھر جوں جوں آفتاب سرد ہوتا جائے گا، یہ بھی فنا سے قریب تر ہوتی جائے گی

بعض کا خیال یہ ہے کہ قانون حرکت کی رُو سے زمین آفتاب سے اور زیادہ دُور ہوتی جارہی ہے، اگر اس کو صحیح مان لیں تو بھی نتیجہ وہی نکلتا ہے، کیونکہ اس صورت میں بُعد بڑھنے کی وجہ سے آفتاب کی حرارت اور کم پہونچے گی، یہاں تک کہ ایک دن برودت نقطۂ انجماد تک پہونچ جائے گی اور آثار حیات بالکل مفقود ہو جائیں گے۔ یہ تو اس صورت میں ہے جب یہ سارا انتظام گردش اسی طرح بغیر کسی خلل کے جاری ہے، لیکن اگر اتفاق سے اسی دوران میں کسی اور سیارہ سے تصادم ہو گیا تو پھر اور جلد خاتمہ ہو جائے گا، بہرحال آپ جو صورت صحیح تصور کریں اور جو واقعات و حوادث پیش آئیں، ان سب کا نتیجہ وہی ایک ہے یعنی یہ کہ کسی نہ کسی دن فنا ہونا ہے

پھر غور کرنے کی بات ہے کہ کیا زندگی کی ساری داستان اس سے زیادہ نہیں ہے، کہ پیدا تو ہوئے ہم غلطی یا اتفاق سے اور ہلاک کئے جاتے ہیں ایک ایسے منظم قانون سے جس کا توڑ کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ افسوس ہے کہ فلکیات کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں، ممکن ہے طبیعیات اس معمہ کو حل کر سکے

فوری ضرورت ہے

معتبر اور دیانتدار شخصوں کی جو بلٹن جار کا اسٹاک رکھیں اور اسکی فروخت کا انتظام کر سکیں تنخواہ ماضہ ماہوار تک علاوہ کرایہ مکان اور ملازم کی تنخواہ کے دیجائیگی۔ مزید تفصیلات کے لئے حسب ذیل پتہ پر انگریزی میں خط و کتابت کیجئے

P.O. Box 6837, Burra Bazar
Calcutta

خدا کی جستجو میں ایک زنگی لڑکی کے تجربات

یہ عنوان ہے برنارڈ شا کی اس کتاب کا جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے اور جس نے دنیا کے مذاہب میں ہلچل ڈال دی ہے۔ یہ کتاب برنارڈ شا نے سنہ ۱۹۳۲ء میں اس وقت لکھی جب وہ کنینا میں مقیم تھا اور اپنے محبوب مشغلہ ڈرامہ نگاری سے ہٹ کر کوئی تصنیف کرنا چاہتا تھا

قصہ اس طرح سے شروع ہوتا ہے کہ ایک حبشی لڑکی بپتسمہ لینے کے بعد مشنری عورت سے سوال کرتی ہے کہ " خدا کہاں ہے ؟ جواب دیا جاتا ہے کہ " اوس کی جستجو کرو مل جائے گا " اس مشنری خاتون کی حالات مجملاً یہ ہیں کہ وہ تیس سال کی گورا رنگ رکھنے والی عورت تھی۔ اور انگلستان میں نجات روح کا حصول دشوار جان کر افریقہ آگئی تھی تاکہ یہاں کے وحشیوں کو تعلیمات مسیح کی طرف مائل کرے۔ وہ فطرتاً بہت عاشق مزاج واقع ہوئی تھی، دَوران تعلیم میں اس نے اپنے اساتذہ سے محبت کی اور کالج سے نکل کر تقریباً ۶ ، ، راہبوں سے، لیکن آخرکار وہ ہر جگہ ناکام رہی اور محبت کے انجام کو اس درجہ تلخ دیکھ کر وہ مذہبی تسکین کی جستجو میں افریقہ آگئی اور اسی دَوران تبلیغ و ہدایت میں ایک حبشی نوجوان لڑکی اسے مل گئی جو خدا کی جستجو کرنا چاہتی تھی

مشنری خاتون سے ملنے کے بعد وہ لڑکی اسی جستجو میں باہر نکلی تو جنگل میں سب سے پہلے اس کو ایک سانپ نظر آیا۔ یہ سانپ ایک راہب کا پالا ہوا تھا۔ لڑکی نے اس کو دیکھ کر اپنا ڈنڈا سنبھالا اور بولی کہ " تجھے کس نے پیدا کیا ہے اور کس مصلحت سے تیرے اندر زہر رکھ کر نوع انسانی کی ہلاکت کا ذریعہ تجھے بنایا " سانپ نے یہ سنکر اوس کو ایک طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ اس نے دیکھا کہ چٹانوں پر ایک ہیبت ناک صورت کا مرد ضعیف الجھی ہوئی داڑھی لئے بیٹھا ہے جس نے پہلے سانپ کو ہلاک کیا اور پھر لڑکی کی طرف مخاطب ہوا۔ لڑکی نے اوس سے کہا کہ " میں خدا کی تلاش میں ہوں " اوس نے جواب دیا " تم کو خدا مل گیا ہے ، فوراً جھک کر میری پرستش

کر ورنہ میرا قہر بے پناہ ہے۔ میں ہی بہشت و دوزخ اور جملہ اشیا کا پیدا کرنے والا ہوں اور میرے ہی ہاتھ بیماریاں اور تباہیاں ہیں۔ فوراً مجھے سجدہ کر اور آیندہ جب تو آئے تو اپنے بچے کو قربانی کے لئے لا کیونکہ مجکو تازہ خون کی خوشبو بہت مرغوب ہے"

لڑکی نے کہا " میں کنواری ہوں میرے کوئی اولاد نہیں ہے"

مرد ضعیف نے کہا کہ " اپنے باپ کو ڈھونڈھ لا وہ مجکو قتل کرے گا اور اپنے رشتہ داروں سے کہہ کہ وہ بہت سی بھیڑیں میری بھوک کو تسکین پہونچانے کے لئے لائیں ورنہ میں سخت وبا پھیلا دوں گا تاکہ لوگ سمجھیں کہ میں خدا ہوں"

یہ سُنکر لڑکی کو غصہ آتا ہے اور وہ اپنا ڈنڈا سنبھالتی ہوئی وہاں سے چلی جاتی ہے

آگے چل کر اسے ایک اور سانپ ملا جس کی دُم کے حلقے چلنے میں بجتے تھے۔ لڑکی نے اوس سے کہا کہ " تو اس سانپ کی طرح خطرناک تو نہیں جو مجھے ابھی ملا تھا، تو پہلے سے لوگوں کو بتا دیتا ہے کہ تو آرہا ہے اور اس لئے غالباً تیرا خدا بھی بہتر ہوگا، مجھے بتا وہ کہاں ہے"

یہ سُن کر سانپ سر کے اشارہ سے لڑکی کو ایک طرف لے گیا۔ لڑکی نے وادی میں ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جس کی داڑھی چاندی سے زیادہ سفید تھی، اوس کے سامنے میز پر بہت سی نظموں کے مسودے بکھرے ہوئے تھے وہ بہت مہربان معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اوس کی چڑھی ہوئی مونچھیں اور اُبھری ہوئی بھویں خود پسندی کا اظہار کر رہی تھیں جس کو حبشی لڑکی نے پسند نہیں کیا۔ اوس نے لڑکی سے کہا کہ

" تم خوف نہ کرو، میں ظالم خدا نہیں ہوں۔ اور مجھ میں سوائے اس کے کوئی عیب نہیں کہ بحث بہت کرتا ہوں میری پرستش نہ کرو۔ مجکو گالیاں دو۔ میرے نقائص تلاش کرو۔ تاکہ مجھے بحث کا موقع ملے"

لڑکی نے پوچھا " کیا تمھیں نے دنیا پیدا کی ہے"

اس نے کہا " ہاں میں نے ہی پیدا کی ہے"

لڑکی " اگر دنیا تم نے پیدا کی ہے تو اس کو اتنی برائیوں سے کیوں بھر دیا

—— شاباش! میں چاہتا تھا کہ تو یہی سوال مجھ سے کرے، تو بہت ذہین لڑکی ہے! عرصہ ہوا میرا ایک بندہ ایوب نامی تھا وہ بھی مجھ سے اسی قسم کی بحثیں کیا کرتا تھا۔ جس کو میں نے سخت اذیتوں میں مبتلا کیا۔ اس کی بیوی مجکو ہمیشہ کوسا کرتی تھی"

لڑکی نے کہا " میں تم سے بحث کرنے نہیں آئی ہوں۔ میں تو یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم نے اگر دنیا کو بنایا تو اتنا خراب کیوں بنایا"

خوب! تو مجھ سے محاسبہ کرنے آئی ہے! تو کون ہے جو میری تخلیق پر نکتہ چینی کرتی ہے۔ کیا تو اس سے بہتر

بناسکتی ہے ؟ سب نہیں تو اس کا چھوٹا ہی ساحصہ بنادے - ایک وھیل مچھلی ہی بناکر دکھادے ،
کیا تو نہیں جانتی - کہ میں نے اگر وہیل کو بنایا ہے تو اوس کے تیرنے کے لئے سمندر بھی بنایا ہے - تیرے
خیال میں کیا یہ معمولی بات ہے "

لڑکی نے کہا " یہ تو کوئی دلیل نہیں ہے ، افسوس ہے تمھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ دلیل کسے کہتے ہیں "

——— " مَیں دلیل نہیں جانتا اچھا ! میں وہ ہوں جس نے ایوب کو ختم کردیا - مجکو تیری حماقت پر ہنسی آتی ہے "

——— " مجھے تمھاری ہنسی کی پرواہ نہیں ، ہنستے جاؤ - لیکن یہ جانتی ہوں کہ تم اس کی کوئی وجہ نہ بتاسکے
کہ تم نے دنیا کو اچھا کیوں نہ بنایا - یہ بھی کوئی جواب ہے کہ اس سے بہتر دنیا بنانے کا معاوضہ مجھ سے کرتے
ہو ——— میں پوچھتی ہوں کہ تم نے سانپ کے مُنھ میں زہر کیوں رکھ دیا - جب کہ وہ بغیر اس کے بھی
زندہ رہ سکتا تھا - گدھوں کو تم نے اسقدر بدشکل اور چڑیوں کو اس قدر خوبصورت کیوں بنایا ؟ ، ایسا
خدا جو میرے سوالات کا جواب نہیں دے سکتا میرے لئے بیکار ہے "

یہ کہکر لڑکی نے اپنا ڈنڈا سنبھالا اور وہاں سے چل دی - ——— وہ اپنے خیالات میں چلی جارہی تھی کہ ایک
خوبصورت یونانی جوان اُسے نظر آیا - لڑکی نے اس کو دیکھتے ہی کہا - " میں خدا کی تلاش میں ہوں کیا تم میری
رہنمائی کرسکتے ہو "

اس نے جواب دیا " اس کی فکر مت کرو - دنیا کو اُسی طرح سے دیکھو جیسی وہ نظر آتی ہے - کیوں کہ اس کے ماوراء کچھ
نہیں ہے - تمام راہیں قبر پر جاکر ختم ہوجاتی ہیں - جو عدم محض کا دروازہ ہے - میری نصیحت پر عمل کرو اور
اپنی ناک کی نوک سے زیادہ اپنی جستجو کو وسیع نہ کرو ، تم ہمیشہ اسی مغالطہ میں مبتلا رہوگی کہ ماوراء
بھی کچھ ہے ،

لڑکی نے کہا - " میرا نصب العین اس سے زیادہ ہے لیکن اپنی آنکھ بند نہیں کرسکتی ، میں تو صرف خدا کی جستجو
کرتی ہوں - اور وہی میری راحت ہے میرا سکون ہے !

——— اچھا اگر تم کو یہ معلوم ہوجائے کہ خدا نہیں ہے تو پھر ——— "

——— " اگر مجھے اس کا یقین ہوگیا کہ خدا نہیں ہے تو میں ایک بڑی عورت ثابت ہوں گی "

جب لڑکی کو یہاں بھی تسلی نہ ہوئی تو آگے بڑھی اور ایک عجیب قسم کا انسان اوس کو نظر آیا جو سیاہ فام
تھا - اور چہرہ پر اوس کے جھریاں پڑی ہوئی تھیں لیکن ان جھریوں سے مہربانی اور رحم کا اظہار ہوتا تھا - وہ چیخ رہا
تھا - جب اوس نے لڑکی کو دیکھا تو چیخنا بند کردیا -

لڑکی نے پوچھا ، " کیا آپ ہی وہ برہنہ پیغمبر ہیں جو حیوانوں کی طرح چلاتے ہیں اور اُلّو کی طرح رویا کرتے ہیں "

اس نے جواب دیا۔ "ہاں، ایک حد تک میں یہی کیا کرتا ہوں، تو کیا چاہتی ہے"

—— "میں خدا کی تلاش میں ہوں"

—— کیا وہ تجکو مل گیا؟

—— "مجکو ایک بڈھا ملا جو چاہتا تھا کہ میں جانور بھون کر اوس کو کھلایا کروں کیونکہ اوس کو یہ خوشبو بہت پسند ہے۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ میں اپنے بچوں کو اوس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھاؤں"

—— "وہ جھوٹا ہے، فریبی ہے۔ خدا کو ان چیزوں کی کیا ضرورت ہے —— وہ تو تمھاری روح کی بندگی سے خوش ہوتا ہے۔ وہ تو تمھاری روح کو چاہتا ہے۔ وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ تم انصاف کرو محبت کرو اور عجز وانکسار کی راہ چلو"

—— "یہ تیسرا خدا ملا۔ یہ قربانی والے خدا اور بحث کرنے والے خدا دونوں سے بہتر ہے۔ لیکن محبت اور انصاف تو دنیا کا حقیر ترین حصہ ہے۔ اور عجز وانکسار سے چلنا بیکار ہے جب ہمکو یہی معلوم نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں"

—— "انکسار سے چلو خدا تمھاری رہنمائی کرے گا"

—— "اُس نے مجکو آنکھیں دی ہیں وہ میری ہدایت کرتی ہیں اوس نے مجکو دل و دماغ عطا کیا ہے۔ اور میں اوس کو استعمال کرتی ہوں —— بڈھے نے ایک چیخ ماری اور لڑکی بدحواس وہاں سے بھاگی۔ کچھ دُور آگے دیکھا ایک ضعیف شخص لکڑی کے کھردرے لٹھے پر بیٹھا ہوا ہے۔

اس نے کہا۔ "تمھارا ڈر اور تمھاری اُمیدیں سب واہمہ کا نتیجہ ہیں۔ ۲۰ سال سے میں اسی مسئلہ پر تحقیقات کر رہا ہوں۔ اور ہزار ہا کتوں کا دماغ نکال کر تجربہ کر چکا ہوں، آج تمام علمی دنیا میرے قدموں کے نیچے ہے اور اس عجیب و غریب تحقیقات کے لئے میری عزت کر رہی ہے"

لڑکی —— "تم نے مجھ سے کیوں نہ پوچھ لیا۔ میں بجائے ۲۰ سال کے صرف ۲۰ سکنڈ میں یہ مسئلہ حل کر دیتی اور ہزار ہا کتوں کی جان بھی بچ جاتی"

—— "یہ واقعہ تو سب کو معلوم ہے لیکن علمی نقطۂ نظر سے اس کا تجربہ نہ کیا گیا تھا۔ کیا تو نے بھی کوئی تجربہ کبھی کیا ہے؟"

—— "بہتیرے، اچھا میں ایک تجربہ ابھی کرتی ہوں۔ کیا تم کو علم ہے کہ تم کس چیز پر بیٹھے ہوئے ہو؟"

—— "میں ایک لٹھے پر بیٹھا ہوں"

—— "بالکل غلط، تم ایک سوئے ہوئے گھڑیال کی پیٹھ پر بیٹھے ہو"

یہ سنتے ہی وہ فلسفی گھبرا کر بھاگا اور بلی کی طرح ایک درخت پر چڑھ گیا

لڑکی نے کہا "نیچے آؤ تم کو جاننا چاہیے کہ گھڑیال تو ہمیشہ دریا کے قریب پائے جاتے ہیں۔ میں تو محض ایک تجربہ کر رہی تھی"

وہ بولا "مین نیچے کیسے آؤں۔ اگر گردن تو گردن ٹوٹ جائے گی"

—— "تم اوپر کیسے گئے تھے؟"

—— "مجکو نہیں معلوم۔ معجزہ پر ایمان لانے کے لئے یہ واقعہ کافی ہے۔ میں کبھی بھی درخت پر چڑھ نہیں سکتا تھا۔ اور اب میں اوپر سے نیچے نہیں اتر سکتا"

—— "واقعی بڑا دلچسپ منظر ہے"

—— "تو بڑی ظالم ہے۔ تونے مجھے مار ہی ڈالا ہوتا"

—— "اگر تم کسی کتے کا نصف بھیجا کاٹ کر اوس کے قلب کو متحرک رکھ سکتے ہو تو تم کو کوئی فکر نہ کرنا چاہیئے لیکن میں افریقہ کے جادو کو تمھارے تجربات سے زیادہ با اثر سمجھتی ہوں میرے ایک نقطہ سے تم بلی کی طرح درخت پر چڑھ گئے۔ کیا تم اس معجزہ پر ایمان لائے؟

—— "کاش کہ تم دوبارہ کوئی ایسا ہی معجزہ پیش کرو۔ تاکہ میں درخت سے نیچے اتر سکوں"

—— "وہ، دیکھو ایک سانپ تمھاری گردن کے قریب بیٹھا ہوا ہے"

یہ سنتے ہی فلسفی گھبرا کر درخت سے نیچے اتر آیا۔ اور پھر دونوں میں باہم گفتگو ہونے لگی، آخر کار جب وہ جانے لگا تو لڑکی نے کہا کہ "قبل اس کے تم جاؤ یہ بتلا دو کہ تم خدا کے وجود کے قائل ہو یا نہیں؟"

اس نے جواب دیا "خدا ایک فضول اور لاطائل مسئلہ ہے۔ یہ تمام کائنات محض چند جھٹکوں کے انعکاس کا نتیجہ ہے میں اگر ابھی تمھارے گھٹنے پر ضرب لگاؤں تو تمھارے پاؤں خود بخود کانپنے لگیں گے"

لڑکی نے کہا۔ "کہیں ایسا کرنا بھی نہیں ورنہ ایسا ڈنڈا رسید کروں گی کہ یاد ہی رکھو گے"

اس کے بعد لڑکی ایک پہاڑی پر پہونچی جہاں ایک صلیب نصب تھی اور ایک رومی سپاہی اس کی حفاظت کر رہا تھا—— وہ آنکھیں بچائے ہوئے چلی جا رہی تھی کہ سپاہی نے چیختے ہوئے کہا "جھک جا۔ رومی انصاف رومی قانون اور رومی امن و سکون کے نشان کے حضور میں جھک جا" لیکن وہ لڑکی علیحدہ کھڑی ہو گئی اور اس قدر تیزی سے اوس نے اپنا ڈنڈا سپاہی کی گردن پر مارا کہ وہ پہاڑی سے نیچے گر گیا، یہاں سے جب وہ آگے چلی، تو پیاس معلوم ہوئی اور ایک کنوئیں کے قریب گئی، جیسے ہی اُس نے کنوئیں سے پانی نکالنے کا ارادہ کیا ایک شخص نے پانی کا گلاس اوس کو دیتے ہوئے کہا کہ "میری یادگار کے طور پر اس کو پی لو"

لڑکی نے پانی پیا اور شکریہ کے ساتھ گلاس واپس دیا، لیکن اس نے گلاس فوراً غائب کر دیا،

لڑکی نے کہا۔ " تم بازی گر ہو۔ تم نے گلاس غائب کر دیا۔ میں خدا کی تلاش میں ہوں۔ مجھے بتاؤ وہ کہاں ہے ؟
اس نے کہا " تمہارے دل میں ہے اور میرے دل میں بھی "
لڑکی نے کہا " میرا بھی یہی خیال ہے لیکن وہ کیا شے ہے ؟ "
بازی گر نے کہا " وہ ہمارا باپ ہے "
لڑکی نے کہا " ہماری ماں کیوں نہیں "
اُسنے جواب دیا " اگر میری ماں میری رہنمائی کرتی تو میں امیر تو ضرور ہو جاتا۔ لیکن خدا کبھی مجھ کو نہ ملتا "
لڑکی نے کہا " میرا باپ بچپن ہی سے مجکو مارا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک دن میں نے اپنے ڈنڈے سے اوس کی خوب خبر لی، لیکن اوس کے بعد بھی اوس نے مجکو ایک سفید فام سپاہی کے ہاتھ بیچ ڈالنا چاہا۔ اس لئے میں باپ کو خدا کبھی نہ بناؤں گی "
بازی گر بولا۔ " لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ بھائی بہن کی طرح آپس میں محبت نہ کی جائے "
لڑکی بولی " لیکن ایک عورت کبھی اپنے بھائی سے محبت نہیں کرتی وہ تو ایک اجنبی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ جس طرح میں تمھاری طرف مائل ہوں "
—— " یہ تو صرف ایک استعارہ تھا۔ ہم سب نوع انسانی کے فرد ہیں اور سب کو باہمد گر محبت کرنا چاہیے "
—— " نہیں میں یہ نہیں کر سکتی میں ہر کس و ناکس سے محبت نہیں کر سکتی۔ مگر سچ بتاؤ۔ کیا واقعی تم مجھ سے محبت کرتے ہو "
—— " ذاتیات سے گفتگو کرنا مناسب نہیں "
—— " لیکن اگر ذاتی مسایل پر گفتگو نہ کی جائے تو یہ کوئی دانشمندی کا فعل نہ ہوگا۔ فرض کرو میں نے یہ کہا کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ جیسا تم کہتے ہو کہ کرنا چاہیے۔ تو کیا یہ تو تم محسوس کر رہے ہو کہ میں تم سے آزادانہ گفتگو کر رہی ہوں "
—— " نہیں تم کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ گو تم سیاہ فام ہو اور میں سفید لیکن خدا کی نظر میں جو ہمارا خالق ہے سب برابر ہیں "
—— " اچھا تم مجھے سفید ملکہ تصور کرو اور خود اپنے کو سفید بادشاہ اس میں کیا حرج ہے، یہ تم گھبرا کیوں گئے "
—— " نہیں کچھ نہیں۔ گو میں غریب سفید لوگوں میں سب سے زیادہ غریب ہوں، تاہم میں اپنے کو بادشاہ ہی سمجھتا ہوں —— لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب انسانوں کی بدمعاشیوں نے مجکو پاگل بنا رکھا تھا "

ــــــ میں نے بڑے بڑے بادشاہ بھی دیکھے ہیں اس لئے تم کو شرمندہ نہ ہونا چاہئے۔ اچھا تم سلیمان بنو، میں ملکہ سبا بنوں اور بالکل اسی طرح جس طرح انجیل میں ہے۔ میں تمھارے پاس آ کر یہ کہوں گی کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں یعنی میں تم پر قابو حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ اور ایک بھوکی شیرنی کی طرح تم کو کھا کر اپنے جسم کا ایک جزو بنانا چاہتی ہوں۔ تاکہ میں تمھارے اور تمھاری خودی کے درمیان، تمھارے اور خدا کے درمیان حائل ہو جاؤں۔ مگر کیا یہ خوفناک ظلم نہ ہوگا ــــــ حقیقت یہ ہے کہ محبت اشیا کو ہضم کئے جا رہی ہے۔ کیا تم ایسی فردوس کا تخیل کر سکتے ہو جس میں محبت بھی ہو"

حبشی لڑکی اور آگے بڑھی تو اسے ایک قدیم ماہی گیر ملا جو اپنے شانہ پر ایک بڑا کلیسا اٹھائے لئے جا رہا تھا اس نے کہا۔

ــــــ "اس بوجھ سے تمھاری کمر ٹوٹ جائے گی"

وہ بولا ــــــ "نہیں میں ایک چٹان ہوں جس پر یہ کلیسہ بنا ہوا ہے"

ــــــ "لیکن تم تو چٹان نہیں ہو اور یہ کلیسہ بہت وزنی ہے"

اس نے کہا "کوئی ڈر کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ یہ صرف کاغذ کا بنا ہوا ہے"

یہ کہکر وہ چلا گیا لیکن اس کے بعد چند ماہی گیر اور سیاہ و سفید لباس پہنے کاغذی کلیسہ لئے ہوئے آئے ان میں سے ہر ایک کہتا تھا کہ اس مچھلی والے کی بات کا یقین نہ کرو"

اس کے بعد وہ آپس میں مصروف جنگ ہو گئے اور لڑکی اس نتیجہ پر پہونچی کہ خدا کا پتہ ان سے نہیں چل سکتا"

جب وہ چلے گئے۔ تو وہ سڑک پر واپس آئی جہاں ایک بوڑھا یہودی اُسے ملا جس نے سوال کیا کہ "کیا وہ آگیا؟"

لڑکی نے پوچھا "کون آگیا؟"

اُسنے جواب دیا "وہی جس نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ جس نے یہ کہا تھا کہ میں جب تک وہ آئے اوس کا منتظر رہوں میں نے اوس کا بہت انتظار کیا۔ اگر وہ اب بھی نہ آیا تو پھر بہت دیر ہو جائے گی، کیونکہ آدمی سوائے قتل و غارت کے اور کچھ نہیں سیکھنا چاہتے"

لڑکی نے کہا "اس کو تو کوئی بھی آکر نہیں روک سکتا"

اس نے کہا۔ "لیکن وہ جاہ و جلال کے ساتھ نمودار ہوگا خداوند کے داہنی جانب بیٹھا ہوگا۔ وہ ہر چیز کو درست کر دے گا"

لڑکی نے کہا " اگر تم چیزوں کی درستی کیلئے دوسروں کے منتظر رہو گے - تم ہمیشہ انتظار ہی کیا کرو گے "

یہودی یہ سنکر چیخ اٹھا - اور لڑکی آگے بڑھ گئی - اب وہ ایک سایہ دار ساحل تک پہونچی - جہاں اس کے ہم قوم دو حبشی نظر آئے ، جو چند سفید رنگ کے لوگوں کے قریب بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے - یہ حبشی ان لوگوں کے قلی تھے

اُس نے ایک حبشی سے سوال کیا کہ یہ کیا قصہ ہے ،

اس نے کہا " کہ یہ عجائب و غرائب کا کارواں کہلاتا ہے "

لڑکی نے سوال کیا " یہ لوگ اچھے ہیں یا بُرے ؟ "

اس نے کہا " یہ لوگ بے خیال ہیں - ذرا ذرا سی باتوں پر جھگڑتے رہتے ہیں ، انھیں سوال و جستجو کا مرض ہے "

اتفاقاً ایک سفید رنگ عورت نے حبشی لڑکی کو دیکھ کر کہا - " بھاگ جاؤ ، یہاں تمھارا کوئی کام نہیں ، تم ہمارے مردوں کو ناکارہ کردوگی "

کچھ اور گفتگو کے بعد حبشی لڑکی نے کہا کہ " تم لوگ کاروانِ عجائب کیوں کہلاتے ہو - کیا تم خدا کے متعلق عجیب و غریب عقائد رکھتے ہو "

یہ سنکر سب نے زور سے قہقہہ لگایا

اور بولے کہ " سیکڑوں برس ہوئے جب متمدن ممالک میں اس قسم کے عقائد پائے جاتے تھے اور خدا کی جستجو کی جاتی تھی "

لڑکی نے کہا کہ " تمھارے یہاں کے پادری تو کہتے ہیں کہ خدا پر ایمان لاؤ اور تم کہتے ہو کہ یہ سب پرانی باتیں ہیں "

ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہا کہ واقعی یہ تو بڑی بُری بات ہے کہ جس بات کا ہمیں یقین نہ ہو اس پر یقین لانے کی ہدایت دوسروں کو کریں ، کیوں نہ صاف صاف کہدیا جائے کہ خدا تو افسانہ ہی افسانہ ہے اور کائنات انتخاب طبیعی کے ذریعہ سے وجود میں آئی ہے "

دوسرے نے جواب دیا کہ " اس میں بڑی خرابی پیدا ہو جائے گی کیونکہ پھر ان لوگوں کا خیال بقاء اصلح کی طرف مائل ہو جائے گا - اور یہ ظاہر ہے کہ ہم لوگ ، ان کے مقابلہ میں کسی طرح " اصلح " نہیں ہیں "

آخر کار حبشی لڑکی یہاں سے بھی آگے بڑھی اور ایک ایسی جگہ پہونچی جہاں لکڑی اور ہاتھی دانت کے بہت سے چھوٹے چھوٹے بت بغرض فروخت رکھے ہوئے تھے ، پاس ہی ایک بڑی چوبی صلیب پر ایک شخص ہاتھ پھیلائے ، ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھے ہوئے پڑا تھا - اور وہ شخص جس کی دوکان تھی اس کو دیکھ دیکھ کر بت طیار کر رہا تھا - ان کو ایک خوب صورت عرب پگڑی باندھے ہوئے اور پہلو میں تلوار لئے ہوئے بہ غور دیکھ رہا تھا - یہ اپنی داڑھی میں شانہ کر رہا تھا

عرب نے کہا۔ "ایسا کیوں کر رہے ہو کیا تم کو معلوم نہیں ہے خدا نے موسیٰ کے ذریعہ سے اس کی مخالفت کی ہے
اسنے جواب دیا کہ "کیا کروں فاقہ سے مجبور ہوں، یہ صناع مجھے معاوضہ دیتا ہے اور میں اس طرح اپنا پیٹ پالتا ہوں اور وہ بھی میرے اور صلیب کے بت بنا کر کھاتا کماتا ہے ——— جب کچھ پونجی میرے پاس جمع ہو جاتی ہے تو میں جاتا ہوں اور لوگوں کو سچائی کی دعوت دیتا ہوں، لیکن جب تک میں ان کو کوئی شعبدہ نہ دکھاؤں، وہ میری طرف توجہ ہی نہیں کرتے"

عرب نے کہا" میرے پاس بھی ایک پیغام ہے۔ اور وہ یہ کہ دنیا میں کوئی عظمت و قوت والا نہیں۔ سوائے اللہ کے۔ اور جب میں اپنی قوم کو یہ پیغام سناتا ہوں تو وہ مجھ سے بھی شعبدہ کے طلبگار ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ میں انھیں جیسا انسان ہوں تو وہ چلے جاتے ہیں لیکن اوروں سے یہی کہتے ہیں کہ میں معجزہ دکھاتا ہوں۔ اور دوسرے لوگ اس کا یقین کر لیتے ہیں کیونکہ وہ اگر یقین نہ کریں تو وہ قتل کر دیے جائیں"

اس نے کہا" لیکن میرا پیغام تو یہ ہے کہ کوئی کسی کو قتل نہ کرے"

عرب نے جواب دیا" یہ ٹھیک ہے، لیکن جو لوگ زندہ رہنے کے قابل نہیں ہیں انھیں فنا کر دینا ہی بہتر ہے، باغ میں پانی بھی دیا جاتا ہے اور خس و خاشاک کو دُور بھی کیا جاتا ہے"

شعبدہ باز نے کہا" اس کا فیصلہ کون کر سکتا ہے کہ ہم زندہ رہنے کے قابل ہیں، میرے متعلق تو بڑے بڑے حاکموں اور پادریوں کا فیصلہ یہی ہے کہ میں زندہ رہنے کے قابل نہیں اور شاید ان کا یہ فیصلہ درست ہو"

عرب ——— "تقریباً یہی فیصلہ میرے متعلق بھی کیا گیا تھا، لیکن جب چند قوی نوجوان میرے ساتھی ہو گئے تو میں نے باغ کو خس و خاشاک سے پاک کرنا شروع کیا"

——— "میں تمھاری ہمت اور عملی فراست کی داد دیتا ہوں"

عرب ——— "میری ان صفات کی داد نہ دو کیونکہ ریگستان کا ہر سردار ان صفات کا مظاہرہ کر سکتا ہے، مجھے تو اپنے علوئے نفس پر ناز ہے جو الہام ربانی کا محل بنا، کیا تم نے کبھی کوئی کتاب لکھی ہے"

شعبدہ باز" نہیں، کیونکہ مجھ پر گفتگو کرنے کا الہام ہوتا ہے لکھنے کا نہیں، میں نے سوائے ایک مختصر سی دعا کے اور کوئی چیز نہیں مرتب کی"

عرب ——— "لکھنا زیادہ کارآمد ہے، خدا نے مجھ سے بہت سی باتیں لکھوائیں، لیکن اس دنیا میں بعض آدمی ایسے بھی ہیں جو خدا کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور ان کے سمجھانے کے لئے مجھے اپنی ذہانت سے بھی کام لینا پڑتا ہے، چنانچہ ان کے لئے میں نے بہشت و دوزخ اور قیامت وغیرہ کے قصے لکھے تاکہ ان پر اثر ہو"

شعبدہ باز۔ " اس میں شک نہیں کہ تم میں کامیاب ہونے کی تمام صفتیں پائی جاتی ہیں "

یہ سنکر بت ساز بولا۔" یہ تمہارا خدا کی قوت و عظمت کا درس دینا بیکار ہے جب تک حُسن کا احساس نہ پیدا ہو اور بت کی صورت میں ہم اُس حُسن کو منتقل نہ کرسکیں، میں ایسے اللہ کو کیا کروں جو بُت بنانے کی مخالفت کرتا ہے "

عرب ــــ " اے کافر تجھے معلوم نہیں کہ حُسن کا یہ احساس لوگوں کو انھیں بتوں کی پرستش پر مجبور کردیتا ہے، عیسائی جنھوں نے خدا کی پرستش کرنا ایک انسان کی صورت میں اختیار کیا تھا، اب وہ ایک بھیڑ کے بچّہ کی صورت میں کرتے ہیں۔ یہ سزا ہے خدا کی طرف سے اس گناہ کی کہ انسان نے خدا کی بنائی ہوئی چیزوں کی نقل شروع کردی تھی۔ وہ تم کو اجازت دیتا ہے کہ عمدہ عمدہ لباس طیار کرو، نفیس قالین بناؤ، لیکن جو کام اس کا ہے اس میں دخل نہ دو۔ بت بنانا اس کی قدرت میں شریک پیدا کرنا ہے "

بت ساز ــــ " تو کیا تمہارا خدا بت ساز ہے، اگر ایسا ہے تو میں یونانی دیوتاؤں کے بعض ایسے بت دکھاتا ہوں، کہ تمہارا خدا بھی عش عش کرنے لگے۔ تمہارا خدا عورت بنا سکتا ہے، لیکن محبّت کی دیوی نہیں بنا سکتا اسے صرف ایک بُت ساز آرٹسٹ ہی بنا سکتا ہے "

یہ کہکر اس نے زہرہ کا مجسمہ نکالا اور کہا " کیا خدا ایسا بنا سکتا ہے "

حبشی لڑکی جو اسوقت تک یہ باتیں خاموشی سے سُن رہی تھی، بولی کہ " اس کے اعضاء سرد ہیں "

لڑکی سے مخاطب ہوکر عرب بولا۔" خوب کہا، ایک زندہ ناکامی مُردہ شاہکار سے بدرجہا بہتر ہے اور اگر تو نے اپنے ایک لفظ سے اس بُت ساز کو ہلاک نہ کردیا ہوتا تو میں اپنی تلوار سے ہلاک کرڈالتا "

بت ساز بولا۔" میں پھر بھی زندہ رہتا، اس لڑکی کے اعضاء ایک دن سنگ مرمر سے زیادہ سرد ہوجائیں گے۔ میری دیوی کے تم دو ٹکڑے کردو، وہ پھر بھی سنگ مرمر رہے گی لیکن اس لڑکی کے دو ٹکڑے کرکے دیکھو کیا باقی رہتا ہے "

عرب نے کہا کہ " مجھے تمھاری گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں " اور پھر لڑکی کی طرف مخاطب ہوکر کہا۔" اے لڑکی میرے گھر میں ایک بیوی کی جگہ خالی ہے، تو خوبصورت ہے، تیری جلد سیاہ اطلس کی طرح چمک رہی ہے، تو زندگی سے معمور نظر آتی ہے "

لڑکی نے سوال کیا۔" اس وقت کتنی بیویاں تمہارے پاس ہیں "

عرب نے جواب دیا۔" میں نے تو عرصہ سے شمار کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ لیکن وہ اتنی ہیں کہ تو ان کو دیکھ کر میرے تجربہ کار شوہر ہونے پر یقین لے آئے گی اور جان لے گی کہ میں ان کو خوش رکھ سکتا ہوں "

حبشی لڑکی - " مجھے خوشی کی جستجو نہیں، میں تو خدا کی تلاش میں ہوں "

شعبدہ باز بولا " کیا تجھے اب تک وہ نہیں ملا ؟ "

لڑکی " مجھے بہت سے خدا ملے، جو ملتا ہے اپنا خدا میرے سامنے پیش کرتا ہے اور اس بُت ساز کے پاس تو نہ جانے کتنے خدا موجود ہیں، لیکن میرے لئے وہ سب نیم مُردہ ہیں "

شعبدہ باز بولا۔ " لیکن خدا اور انسانیت کے درمیان تعلق پیدا کرنے کے لئے کسی خدا کو آدمی ضرور بننا چاہئے "

لڑکی " ہاں اگر وہ آدمی عورت ہو تو بہتر ہے کیونکہ وہ خدا جو مرد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اپنی توہین کرتا ہے۔ لیکن عورت کا خدا ہو جانا اس کے لئے مناسب ارتقاء ہے "

عرب نے یہ سنکر کہا " نعوذ باللہ یہ عورت تو بڑی جھگڑالو ہے، یہ بھی خدا کی شان ہے کہ عورت کو حسین بنایا تو اسی کے ساتھ ضدی بھی کر دیا "

اس کے بعد برنارڈ شا نے اسلامی مسئلہ ازدواج کو سامنے رکھ کر مکالمہ کو زیادہ وسیع کر دیا ہے اور جناب عائشہ کے متعلق اچھا خیال ظاہر نہیں کیا ——— آخر کار حبشی لڑکی یہاں سے یہ کہتی ہوئی بھاگ جاتی ہے کہ " جہاں مرد عورتوں کا ذکر کر رہے ہوں، وہاں خدا کا کیا گزر "

اب وہ ایک گاؤں میں پہونچی جہاں بہت خوب صورت باغ تھا۔ اوس کا مالک ایک بوڑھا آدمی تھا لڑکی نے اوس کو روک کر " خدا کی بابت سوال کیا "

مرد ضعیف نے جواب دیا کہ " ادھر آؤ، بڑے تجربہ کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے کہ خدا کو ڈھونڈھنے کی بہترین جگہ باغ ہے، وہاں زمین کھودو تو وہ مل جائے گا "

لڑکی نے کہا۔ " نہیں، مجھے ایسا خدا نہیں چاہئے، میرا خیال اس کے متعلق کچھ اور ہے "

بڈھے نے پوچھا " کیا تمھارے خیال نے اس وقت تک کوئی صحیح رہبری کی ہے ؟ "

لڑکی نے کہا۔ " نہیں ایسا تو نہیں ہوا لیکن میں تمھارے خیال سے بھی متفق نہیں ہوں "

بڈھے نے کہا۔ " بہت سے لوگوں نے خدا پالینے کے بعد بھی اس کو پسند نہیں کیا۔ پھر تم یہ کیوں یقین کرتی ہو کہ تم اسے پسند کروگی۔ بیوقوف نہ بنو، خدا تمھاری کہنیوں کے پاس ہے اور ہمیشہ یہیں رہا ہے، لیکن اس نے اپنے آپ کو پوری طرح کبھی ظاہر نہیں کیا کہ مبادا تم پاگل ہو جاؤ، اس لئے بہتر طریقہ یہی ہے کہ تم ایک چھوٹا سا باغ طیار کرو، زمین کھودو، پودے لگاؤ "

لڑکی یہ سُن کر اوس کے ساتھ باغ میں چلی گئی۔ جہاں روزانہ آدمی آتے جاتے رہتے تھے، ایک دن ایک شخص آئرلینڈ کا رہنے والا آیا اور باغ کے بائیں حصہ میں کام کرنے لگا

لڑکی نے اوس سے پوچھا تم یہاں کیونکر آئے

اس نے کہا۔" میں خود آیا ہوں ؟

لڑکی نے کہا۔" لیکن یہ باغ تو اس بوڑھے کی ملکیت ہے "

اسنے جواب دیا۔" میں سوشلسٹ ہوں اور اس عقیدہ کا نہیں ہوں کہ باغ کسی تنہا شخص کی ملکیت ہو سکتا ہے "

لڑکی نے کہا۔" تو تم خدا کی تلاش میں نہیں آئے ہو ؟ "

اس نے کہا۔" اگر خدا کو میری ضرورت ہو گی وہ خود مجھے تلاش کرلے گا۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ وہ ویسا نہیں ہے جیسا کہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ وہ ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے "

لڑکی اور بوڑھا دونوں اس شخص کی کج خلقی کے شاکی تھے لیکن چونکہ وہ کام بہت کرتا تھا اس لئے اوس کو علٰحدہ بھی نہ کرتے تھے۔ ان لوگوں نے اوس کو عمدہ خصایل اور خوش زبانی کی تعلیم دینے کی کوشش کی۔ لیکن کوئی عقیدہ اوس کے دل میں یہ خیال نہ پیدا کرسکا کہ خدا بھی کوئی کامیاب نقش ہو سکتا ہے

ایک دن اُس بوڑھے شخص نے اوس لڑکی سے کہا " کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ تم ایسی جمیل عورت کا شوہر ہو۔ اور اس سے بچے پیدا ہوں۔ میں تو خیر بہت بوڑھا ہو گیا ہوں، لیکن یہ آئرلینڈ کا باشندہ موزوں ہو گا "

چونکہ اوس بوڑھے سے لڑکی کا تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے اوس کو یہ خیال بہت ناگوار گزرا وہ تمام رات اس نوجوان کو باغ سے نکال دینے کی اسکیم پر غور کرتی رہی۔ لیکن بعد کو وہ لڑکی بھی شادی کے لئے تیار ہو گئی۔ چنانچہ وہ دونوں اس کے پاس گئے اور لڑکی نے کہا کہ وہ اوس سے شادی کرنے والی ہے

اوس نے اپنا کدال اٹھا لیا اور نہایت خوفناک آواز نکال کر باغ کی دیوار سے پھاند جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن حبشی لڑکی نے اوس کو مضبوطی سے پکڑ لیا

اسنے غصہ سے کہا۔" کیا میں ایک حبشی لڑکی سے شادی کرلوں ؟

لیکن حبشی لڑکی نے اوس کو اپنی آہنی گرفت میں دبوچ لیا۔ اور ڈیڑھ گھنٹہ کی گفت و شنید کے بعد شادی ہو گئی ——— بعد کو حبشی لڑکی کے بچے ہو گئے۔ اور خدا کا تخیل بھی اوس کے دماغ سے نکل گیا

یہ ہے خلاصہ برنارڈ شا کی اس کتاب کا جس نے اس وقت مذہبی تنقید کی دنیا میں ہلچل ڈال دی ہے۔ برنارڈ شا نے اس کتاب میں صرف انجیل اور قرآن یا بالفاظ دیگر علیسویت و اسلام سے بحث کی ہے۔ اور اس کا مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کا تصور آہستہ آہستہ کیونکر بلند ہوتا گیا۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ مذہب کو انسانی زندگی کے لئے نہ صرف یہ کہ غیر ضروری بلکہ مضرت رساں بھی خیال کرتا ہے

وہ اسی کتاب کے آخری باب میں جہاں اس نے اپنے خیالات کو بغیر کسی استعارہ و تشبیہ کے زیادہ صاف و صریح الفاظ میں بیان کیا ہے، ایک جگہ لکھتا ہے کہ قدیم پرستارانِ خدا صرف تلوار و نیزہ رکھتے تھے اور وہ اپنے مخالفین کا قتل عام نہ کر سکتے تھے لیکن آج جبکہ مشین گنوں، ہوائی جہازوں، زہریلی گیسوں نے ہلاکت کو اسقدر عام و ارزاں کر رکھا ہے، بچوں کی تعلیم نوح اور یوشع سے بہتر ہونی چاہئے یعنی اگر ہم بائبل کو علحدہ نہیں کر سکتے تو وہ ہم کو علحدہ کر دے گی اگر ہم نے اس کا مطالعہ صحیح تنقید کی روشنی میں نہ کیا۔ کوئی وجہ نہیں کہ قرآن، اپنشید اور الف لیلہ پر تو تنقیدی نگاہ ڈالی جائے اور بائبل کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

معلومات اور حقایق کے لحاظ سے بائبل کی یہ حالت ہے کہ اگر اس کے بیانات پر اعتبار کر کے کوئی طالب علم تخلیق عالم، اسرارِ حیات اور رموزِ مابعد الطبیعیات کے متعلق سوالات کا جواب دے تو فیل ہونا تو خیر کوئی بات ہی نہیں، سیدھا پاگل خانہ بھیجدیا جائے کہ یہ بک کیا رہا ہے

بائبل صرف ایک یادداشت ہے اس بات کی کہ زمانۂ قدیم میں انسان کی عقل کسقدر ناقص تھی اور انسانیت اپنے عہدِ طفلی میں کیا کیا خواب دیکھ رہی تھی۔ اس لئے اس کی حیثیت بالکل ایسی ہے جیسے انسائکلوپیڈیا کا پہلا اڈیشن کہ یادگار کے طور پر الماری کی زینت بنی رہے اور یہ اندازہ کرنے کا موقعہ ملے کہ ذہن انسانی نے رفتہ رفتہ کس قدر ترقی حاصل کی ہے

عہد نامۂ عتیق و جدید کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے مفہوم و تصوّر میں رفتہ رفتہ کیا تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔ جو خدا نوح کا تھا وہ ایوب کا نہ تھا اور جو ایوب کا خدا تھا وہ مسیح کا نہ تھا۔ نوح کا خدا تو وہ تھا جس نے طوفان برپا کر کے سارے زمانہ کو تباہ کرنے میں تامل نہ کیا اور صرف ایک خاندان کو زندہ چھوڑ دیا۔ اور پھر حکم دیا کہ قربانیوں کے جلتے ہوئے گوشت کی بُو سے اسے خوش کرے

ایوب کا خدا زیادہ متحمل، زیادہ استدلال پسند، اور زیادہ فلسفی تھا جس نے شیطان سے شرط کی تھی کہ وہ ایوب کو گمراہ نہ کر سکے گا ——— اس کے بعد (Micah) کے خدا کا مرتبہ ہے جو نوح کے خدا کی طرح قربانی چاہتا تھا، نہ ایوب کی خدا کی طرح حجت پسند تھا۔ بلکہ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ انسان راستی اختیار کرے، اور محبت کرنا سیکھے۔ پھر مسیح کا خدا آیا جو اور زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ کیونکہ وہ انسان کو اپنا مظہر قرار دینا چاہتا تھا، لیکن بُت پرستی کے جراثیم ہنوز باقی تھے۔ اس کے ۶۰۰ برس بعد محمدؐ نے جو تصور خدا کا پیش کیا وہ بہت ارفع و اعلےٰ تھا۔ اور اس میں ایسی خالص وحدانیت پائی جاتی تھی جو اس سے قبل کبھی پیش نہیں کی گئی، لیکن جاہل عربوں کو راہ راست پر لانے کے لئے بہشت، و دوزخ، حشر و نشر، عذاب و ثواب کے تدابیر انھیں بھی اختیار کرنا پڑیں، اس لئے مسلمانوں کے لئے بھی لازم ہے کہ وہ اسلام کو دوبارہ کھود کر نکالیں اور اس کے چہرہ کے اصلی

خد و خال پیش کریں ورنہ اس کا بھی وہی حال ہوگا جو دیگر قدیم مذاہب کا ہوا ہے"

برنارڈ شا، اشتراکیت کا حامی ہے اور اسی لئے اس کا میلان موجودہ بالشویزم کی طرف ہے، وہ چاہتا ہے کہ مذاہب کو دنیا سے نیست و نابود کر دیا جائے، کیونکہ بغیر اس کے انسانیت کا انتشار دور نہیں ہو سکتا اور نہ سرمایہ داروں کی لعنت سے انسان آزاد ہو سکتا ہے

رسول اللہ کی ازدواجی زندگی کے متعلق جن الفاظ میں اس نے اظہار خیال کیا ہے وہ کسی ذاتی تحقیق پر مبنی نہیں معلوم ہوتا بلکہ وہی آواز ہے۔ جو عیسوی دنیا میں عرصہ سے گونج رہی ہے

ہر وہ شخص جو کسی خاص ماحول میں پرورش پاتا ہے مجبور ہوتا ہے کہ وہ اسی مخصوص نقطۂ نظر سے دوسروں کے حالات کا مطالعہ کرے جو گہوارہ سے اس کے سامنے رہا ہے۔ مسئلہ ازدواج میں یوروپین ذہنیت چونکہ جذبۂ شہوانی سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہے اس لئے برنارڈ شا سا آزاد خیال انسان بھی اس سے مغلوب ہو گیا، ورنہ اگر وہ انصاف سے کام لیتا تو اس کو معلوم ہوتا کہ رسول اللہ کی تمام شادیاں صرف وقتی ضرورت و مصلحت کی بنا پر ہوئیں اور ان میں سے کوئی ایک رشتۂ ازدواج بھی ایسا نہیں تھا جس سے مقصود صرف شہوت رانی ہو

خدا کے متعلق خود برنارڈ شا کا جو خیال ہے، وہ آئرلینڈ کے اس باشندہ کی زبان سے ظاہر کیا گیا ہے۔ جس کے ساتھ حبشی لڑکی کی شادی ہوئی تھی، یعنی نہ صرف یہ کہ وہ خدا کے وجود کا قایل نہیں ہے۔ بلکہ اس خیال و عقیدہ کو نوع انسانی کی ترقی کے منافی سمجھتا ہے

یہ کتاب صرف ۷۵ صفحات کی ہے اور ۱۲؍ میں ہر جگہ مل سکتی ہے

ضرورت ہے شوہر کی

ایک ۱۸ سال کی نوجوان، خوشرو، سلیقہ مند اور تعلیم یافتہ لڑکی کے لئے ——— معاش کی طرف سے اطمینان ہونا چاہئے، اور عمر ۳۰ سال سے زاید نہ ہو ——— یو۔پی کے باشندہ کو ترجیح دی جائے گی

اڈیٹر صاحب نگار سے ہر طرح کا اطمینان کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ لڑکی اور اس کے خاندان سے بخوبی واقف ہیں ——— خط و کتابت اس پتہ سے کی جائے

ا - ن - ذریعہ مینیجر نگار - لکھنؤ

فسانہ نہیں حقیقت!

یہ سرگزشت ہے ایک نوجوان کی جو اکثر دفتر نگار میں آتے ہیں اور گھنٹوں مغموم و خاموش بیٹھ کر چلے جاتے ہیں

میں سمجھا کرتا تھا کہ ان کا یہ "سوگ" شاید فطری چیز ہے، لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ سوسائٹی کے مظالم کا شکار ہیں اور ایک سے زاید بیویاں کرنے کی جو مذموم رسم مسلمانوں میں قایم ہو گئی ہے اسی کے شکار یہ بھی ہیں

اڈیٹر

(۱)

بیمار نے آنکھیں کھولیں۔ داہنی طرف اس کی بھانجی صالحہ اور اس سے کچھ دور اس کی پہلی بیوی خالدہ بیٹھی ہوئی تھی پائنتی کی طرف اس کی لڑکی زبیدہ پنکھا جھل رہی تھی۔ اس نے نحیف آواز میں کہا "پانی لاؤ" فہیم اور عزیز نے گردن اور پیٹھ میں ہاتھ ڈال کر اُٹھایا۔ پانی پینے کے بعد مریض ایک ہلکی کراہ کے ساتھ پھر لیٹ گیا۔ دفعتہً اس نے کہا "فہیم" اور جب فہیم اس کے قریب تر ہو گیا تو اس نے کمزور تھرتھرائی ہوئی آواز میں کہا "دیکھو اب تک نعیم نہیں آئے تم نے پرسوں خط بھیجا تھا۔ کل انھیں ملا ہوگا۔ اور اس حساب سے انھیں آج ضرور آجانا چاہیے تھا۔ تم انھیں ایک تار دے دو کہ فوراً آجائیں۔ تم لوگ میری حالت دیکھتے ہی ہو میں نہیں چاہتا کہ میرے بچے ایسی حالت میں مجھ سے علیحدہ رہیں ...... جائداد کا انتظام ہوتا رہے گا" فہیم نے ایک سعادت مند بیٹے کی طرح "اچھا ابا" کہا۔ اور اسٹیشن تار دینے چلا گیا

ناصر علی شہر پٹنہ کے معززین میں شمار کئے جاتے تھے۔ جائداد کافی تھی۔ شہر میں مکان مسکونہ کے علاوہ تین مکان اور بارہ دوکانیں کرایہ پر چلتی تھیں۔ عہد شباب میں وہ ایک ریاست کے منیجر تھے۔ اور تقریباً پچیس سال تک ریاست کی خدمات انجام دیتے رہے۔ لیکن اُن کا عروج حاسدوں کی آنکھوں میں خار بنکر کھٹکا۔ راجہ صاحب سے لگائی بجھائی

کی گئی - چونکہ اس ریاست میں یہ اور ان کے دیگر بزرگ اچھے عہدوں پر رہ چکے تھے نیز ان کی ذاتی قابلیت اور حسن انتظام سے بھی راجہ صاحب خوش تھے اس لئے ان سے کوئی محاسبہ نہیں کیا گیا - لیکن جب انھیں اپنی نسبت معلوم ہوا کہ اغیار غلط بیانی سے کام لے کر میری جانب سے راجہ کے دل میں بس بو رہے ہیں تو انھوں نے استعفیٰ دینا ہی مناسب سمجھا - اس کے بعد وہ اپنے مکان پٹنہ میں آکر مقیم ہو گئے

ناصر علی میں بجز اس کے کہ وہ حد سے زیادہ وضعدار تھے - اور کوئی خاص خصوصیت نہ تھی - اور یہی وجہ تھی کہ ایک سال کی بیماری سے صحت پانے کے بعد ڈاکٹر کے منع کرنے کے باوجود جب انھوں نے دماغی کام زیادہ کیا تو وہ پھر بیمار ہو گئے - ابھی معمولی بخار ہی تھا کہ پیٹھ میں سرطان نمودار ہو گیا چھ ماہ تک وہ موت اور حیات کے درمیان لٹکے رہے مستند ڈاکٹروں اور حکیموں کے علاج سے اس سے بھی نجات ملی - لیکن سن رسیدہ آدمی کا کسی ایسے مرض مہلک میں مبتلا ہو کر بچ نکلنا دشوار ہوتا ہے - حد درجہ کمزور اور نقیہ ہونے کے سبب سے نہ تو ان کی اب غذا ہوتی تھی اور نہ وہ اچھی طرح چل پھر سکتے تھے - نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے کھانسی اور پھر حرارت نے بخار کی صورت اختیار کر کے ان پر اپنا تسلّط جما لیا - ہر قسم کا علاج ہوا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا

ایک ہفتہ سے ان کی حالت روز بروز زیادہ گرتی جا رہی تھی - اور انھیں تو خیر اپنی موت کا یقین تھا ہی لیکن اعزہ بھی ان کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے

(۲)

باہر سے معصوم وحید دوڑتا اور چیختا ہوا اندر پہونچا - "امّی - امّی - بڑے بھیا آگئے" - ناصر علی نے بھی سنا اشارہ سے رشید کو پاس بلایا اور پوچھا "کیا نعیم آگئے" اور جب جواب اثبات میں دیا گیا تو کہا "اچھا انھیں بلا لو" ابھی رشید کمرہ سے باہر نہ گیا تھا کہ نعیم بیمار باپ کے کمرے میں پہونچ گئے - ادب سے سلام کیا اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے جلد نہ پہونچنے کی مجبوریاں بیان کرنے لگے

آج ناصر علی کی طبیعت کچھ سنبھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی - چہرہ روز کی طرح پژمردہ نہ تھا - شام کو انھوں نے اپنے جملہ متعلقین کو اپنے پاس بلا کر بٹھایا - ایک طرف ان کی دونوں بیویاں خالدہ اور سعیدہ اور ان کے پاس ہی ان کی بھانجی صالحہ بیٹھی ہوئی تھی - سامنے کرسی پر نعیم بیٹھے ہوئے تھے اور کرسی کو پکڑے ہوئے نعیم کے سوتیلے بھائی عزیز اور رشید کھڑے تھے - پلنگ کے پائنتی ان کی نو سالہ بچی زبیدہ بیٹھی ہوئی تھی - خود ناصر علی تکیہ کی ٹیک لئے بیٹھے ہوئے تھے - ان کی گود میں معصوم وحید تھا اور سرہانے ان کا سب سے بڑا لڑکا نعیم بیٹھا ہوا تھا - ان کے دیگر اعزہ بھی کچھ کھڑے اور کچھ بیٹھے ہوئے تھے - پہلے تو انھوں نے کمزور آواز میں حقوق انسانی اور اتفاق پر لکچر دیا کہ کس طرح ایک انسان دوسرے کی مدد کا محتاج ہے - اور کس طرح انھوں نے اپنی پچپن سال کی زندگی میں اپنے دوسرے غریب رشتہ داروں

کی ہر قسم کی امداد سے کبھی پہلوتہی نہیں کی اور ہمیشہ ان کے رنج و راحت کے شریک رہے۔ اور اس کا نتیجہ دکھلاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہی وجہ ہے کہ دوسرے لوگ آج بھی مجھے رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کیونکہ میری حیثیت اپنے خاندان کے افراد پر مثل ایک سردار کے تھی۔ پھر نعیم اور فہیم کو مخاطب کر کے کہا۔ "بیٹے! زندگی اور موت کا کوئی بھروسہ نہیں۔ بہتوں کو دیکھا کہ چلتے چلتے گرے اور دم نکل گیا۔ انسان کی زندگی ہی کیا۔ اس لئے اگر میں مرجاؤں تو صبر کرنا، میں نے تم دونوں کو پڑھایا لکھایا بیاہ کیا ماشاءاللہ ذی ہوش نوجوان ہو اپنے قوت بازو سے روزی حاصل کرنے والے ہو اس لئے اب تمھارے حقوق مجھ پر نہیں ہیں۔ البتہ میرے حقوق ضرور تم پر ہیں۔ جس طرح انسان درخت لگاتا ہے اس کی آبیاری کرتا ہے دنیا کی سردی گرمی سے اس کی نگہداشت کرتا ہے اور پھر اس کے بڑھنے پر اس کے سایہ میں بیٹھ کر خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح بیٹے! تم میرے لگائے ہوئے درخت ہو اور الحمدللہ کہ تمھارے سایہ میں میں خوش ہوں"

پھر عزیز اور رشید کی طرف اشارہ کر کے وحید کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے۔ "دیکھو یہ تمھارے بھائی ہیں اور وہ تمھاری بہن ہے۔ دنیا کی نظروں میں یہ تمھارے سوتیلے بھائی اور بہن ہیں۔ لیکن تم لوگ انھیں ایسا نہ سمجھنا ایک حقیقی بھائی کی طرح ان سے محبت کرنا۔ معصوم وحید اور ناسمجھ عزیز و رشید میرے بعد یتیم ہو جائیں گے اسوقت تمھیں ان کے مربی اور سرپرست ہوگے ایسا نہ ہو کہ تم لوگوں کی لاپرواہی سے ان کی تعلیم نہ ہو سکے یا خدانخواستہ نااتفاقی کی ہوا ان کو تم سے جدا کر کے آوارہ کر دے۔ یہ سمجھ لو کہ ابھی وہ نئی شاخ کی طرح ہیں۔ جس طرف موڑوگے مڑ جائیں گے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر تم لوگ ان کے ساتھ محبت سے پیش آؤگے تو عمر بھر یہ اپنے کو تمھارا خادم سمجھیں گے۔ اس لئے .... ایسا نہ ہو میرے لگائے ہوئے باغ میں خزاں آئے اور اغیار کو ہنسنے کا موقع ملے۔ بولو! کیا تم دونوں میری وصیتوں پر عمل کروگے"

نعیم کی آنکھوں سے ایک نہ رکنے والا چشمہ رواں تھا۔ فہیم کا رومال آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔ عزیز رشید کو سینے سے لپٹائے الگ رو رہا تھا۔ معصوم زبیدہ کے ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ دونوں بیویاں خالدہ اور سعیدہ بری طرح بین کر رہی تھیں۔ رہ رہ کر رو بھی جاتی اور ان دونوں کو خاموش کرنے کی کوشش بھی کرتی تھی۔ البتہ ایک معصوم وحید تھا جو گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن جب چاروں طرف اسے ایک ہی منظر نظر آیا تو وہ بھی باپ سے لپٹ کر رونے لگا

ناصر علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا " دیکھو تم لوگوں کو میں نے اس لئے اپنے پاس نہیں بٹھایا ہے کہ رو رو کر میری طبیعت اور بھی پریشان کرو میں بہت کمزور ہوں زیادہ بات بھی نہیں کر سکتا۔ اس لئے نعیم اور فہیم کیا تم دونوں عہد کرتے ہو کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس کو کروگے"

نعیم نے باپ کے کمزور ہاتھ کو بوسہ دیتے اور آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ابا"! میں آپ کی ہر وصیت پر

عمل کروں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اپنی بہن بھائیوں کو چاہے مجھ پر کتنی ہی مصیبت کیوں نہ ہو کبھی کوئی تکلیف نہ پہونچنے دوں گا" اور اس کے بعد اُس کی ہچکیاں بندھ گئیں ۔ ناصر علی نے نعیم کو سمجھاتے ہوئے عزیز اور رشید کو اپنے پاس بُلایا اور ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر ان کے ہاتھوں کو نعیم اور فہیم کے ہاتھوں میں دے کر کہا "خدا کرے تم لوگ اپنے وعدہ پر مستقل رہو پھر خالدہ کو نزدیک بُلا کر فہیم سے کہا ۔ " اس کے سر پر ہاتھ پھیر و خبردار اسے کوئی صدمہ نہ پہونچے اس کا دل نہ ٹوٹے" غریب خالدہ فہیم کی گردن میں ہاتھ ڈال کر رونے لگی ۔ معصوم وحید جب بمشکل سے خاموش ہوا تو اسے پیار کرتے ہوئے اپنی بڑی بیوی خالدہ سے کہا ۔ " لو اسے گود میں لے کر پیار کرو اور وعدہ کرو ۔ کہ کبھی نعیم اور فہیم سے کم اسے نہ سمجھو گی ۔ اور تم دونوں آپس میں بہنوں کی طرح رہو گی " خالدہ نے سعیدہ کو سینے سے لگا کر روتے ہوئے کہا ۔ " میں آپ کا فرمان سر آنکھوں سے بجالاؤں گی ۔ خدا کا دیدار اور رسول کی شفاعت محشر میں مجھے نصیب نہ ہو ۔ اگر میں آپ کے کہنے پر عمل نہ کروں ۔ یا کسی بچے کو اپنا نہ سمجھ کر اس کا دل دکھاؤں" ناصر علی نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا ۔ " بس اب میری روح سے بہت بڑا بوجھ اُتر گیا ۔ مجھے اطمینان ہے کہ تم لوگ میرے کہنے پر عمل کروگے اور لوگوں کے لئے اتفاق اور اتحاد کی مثال بنوگے ۔ اس کے بعد انھوں نے کھانا منگوا کر سب کو اپنے سامنے بمشکل کھلوایا ۔ اور دیر تک سمجھانے کے طور پر نصیحتیں کرتے رہے

ناصر علی کو سب سے زیادہ عزیز ان کا لڑکا عزیز تھا یوں تو انھیں ایک باپ کی حیثیت سے سب بچوں سے محبت تھی لیکن عزیز کے ساتھ انھیں عشق تھا ۔ دو سال کی عمر سے لے کر اب جبکہ اس کی عمر پندرہ برس کی تھی ۔ کبھی اپنے سے اسے جدا نہیں کیا ۔ اور اسی محبت کا نتیجہ تھا کہ اسے کوئی معقول تعلیم وہ نہ دلا سکے ۔ جب سے ناصر علی بیمار پڑے عزیز کو کھانا پینا حرام ہو گیا ۔ ہر وقت اسے باپ کے آرام کی فکر ۔ ہر گھڑی اس کی یہ دعا کہ باپ اچھا ہو جائے ۔ رات کو آٹھ بجے سے دس بجے تک تو وہ سو لیتا باقی تمام رات مریض کے باپ کے سرہانے بیٹھ کر گذار دیتا کہ شاید انھیں کسی چیز کی ضرورت ہو اور وہ کمزوری کے سبب سے کسی کو پکار نہ سکیں

نعیم کے آنے کے تیسرے روز رات کو چار بجے کے قریب جب تمام گھر کے لوگ سو رہے تھے عزیز کو معلوم ہوا ۔ جیسے اس کے باپ نے ہاتھ کو پلنگ پر پٹخا عزیز فوراً ہی سامنے پہونچا اور پوچھا ۔ " کیا ہے ابّا " لیکن انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ تنفس کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی دو تین بار پکارنے کے بعد جب اس نے بخار معلوم کرنے کے لئے پیشانی پر ہاتھ پھیرا تو اُسے سردی کے موسم میں ماتھے پر پسینہ کے قطرے معلوم کرکے حیرت ہوئی ۔ اور آخر اس عقدۂ لاینحل کو سمجھنے کے لیے بڑے بھائی نعیم اور فہیم کو جگا دیا ان لوگوں کے اُٹھتے ہی اور سب لوگ بھی اٹھ بیٹھے ۔ اور ناصر علی کے پلنگ کے گرد جمع ہو گئے ۔ اعزہ میں جو لوگ سن رسیدہ تھے ۔ وہ سمجھ گئے کہ ان کے سفر کا وقت آگیا کسی نے یٰسین اور کسی نے کلمۂ طیبہ پڑھنا شروع کیا ۔ پلنگ کی ایک جانب نعیم و فہیم اور دوسری جانب عزیز "مسافر"

کے پلنگ پر جھکا ہوا تھا۔ دونوں بیویاں خالدہ اور سعیدہ انجام کی تصویر آنکھوں میں لئے ہوئے حیران و ششدر پائنتی کھڑی ہوئی تھیں۔ کہ ایک مرتبہ ناصر علی نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں کچھ کہنے کی کوشش کی اور پھر حسرت بھری نظر سب کی طرف ڈال کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی

(۳)

عزیز بیحد مغموم تھا۔ اسے مطلب پرست دنیا کی بیوفائی پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔ لیکن ایک بے بس اور بیکس یتیم کی طرح وہ اپنے غصہ کی آگ اپنے آنسوؤں سے بجھا رہا تھا۔ اس لئے اپنے عہد گزشتہ سے عہد حال کا موازنہ کیا۔ کہ کس طرح وہ اپنے باپ کی زندگی میں آرام اور بے فکری کی زندگی بسر کرتا تھا۔ جب وہ اپنے باپ کے ہمراہ ان کے دوستوں کے یہاں جاتا تو کس طرح لوگ پیار اور محبت سے اس سے پیش آتے تھے۔ جب وہ اپنے سبزہ رنگ گھوڑے پر سیر کو نکلتا تو کیسے لوگوں کی انگلیاں اس کی طرف اٹھتی تھیں۔ خود جب وہ اپنے گھر میں ہوتا تو اس کے سوتیلے بھائی کیسے پیارے لفظوں سے اسے مخاطب کرتے تھے۔ اس کی سوتیلی ماں نے کبھی بھیا اور چھوٹے میاں کے علاوہ عزیز کہہ کر بھی نہیں بلایا۔ پھر اس نے اپنے باپ کے انتقال کے بعد کے واقعات پر غور کیا کہ اس کے سوتیلے بھائیوں اور ماں نے کس کس طرح اس کی اور اس کے چھوٹے بھائیوں اور بہن کی دلجوئی کی۔ پھر اس نے اس وقت خیال کیا جب رشید و وحید کو ایک میلے کے دکھانے کے سلسلہ میں سائیکل سے ٹکرا کر بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ اور جس وقت دوسرے لوگ بیہوش رشید کو ڈولی میں ڈال کر اس کے گھر لائے تو وہ خود اور اس کی ماں بہن کس بری طرح سے روتی تھیں۔ لیکن اس کا بھائی فہیم بگڑ بگڑ کر کہہ رہا تھا کہ کیوں وہ میلہ گیا۔ اور اگر زخمی ہوا تھا تو وہیں کیوں نہ مر گیا اس کی سوتیلی ماں نے کہا۔ ”صاحب زادے آوارہ گردی میں سر پھوڑ کر گھر آدیں، مفت کے روپے کہاں سے آویں گے جوان کا علاج کیا جاوے گا“ پھر اس کی نظروں میں اس وقت کا منظر آیا۔ جب اس کا چھوٹا بھائی وحید اپنی بڑی ماں کے ہاتھوں اس قصور پر پٹا تھا کہ باورچی خانہ سے اس نے مرغی کیوں نہیں ہنکائی۔ اور جب اس کی ماں نے اعتراضاً منع کیا کہ بچے کو مچیوں سے اس طرح نہ مارنا چاہیئے تو اس سے اس طرح کہا گیا کہ ”بی بی تم اس گھر میں حاکم بنکر تو رہ نہیں سکتیں ذرا سا ہاتھ لگا یا تو اس کے لعل گر گئے۔ نہ کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے ہمارے بچے تو اپنا خون پانی کر کے کمائیں اور تم لوگ حرام ایسا کھا کر ہم ہی پر آنکھیں نکالو“ اس نے اپنی بابتہ سوچا کہ باپ کے انتقال کے بعد جب جہلم میں تمام عزیز جمع ہوئے تو اس کے اور رشید کے لیے رائے زنی ہونے لگی کہ کس قسم کی تعلیم دی جائے۔ کسی نے کہا اس کا رجحان آرٹ کی طرف ہے اس لئے اس سے دریافت کر کے جس کام کو سیکھنا چاہے اسے سکھایا جائے۔ کسی نے رائے دی اس کا دماغ بہت اچھا ہے اسے انگریزی کی تعلیم باقاعدہ کسی کالج میں دی جائے۔ لیکن یہ محض خیال آرائیاں تھیں جن کا وجود حقیقت میں کچھ نہ تھا۔ اسے اس وقت کا بھی

خیال آیا جب اس کے سوتیلے بھائی ہر وقت طعن و تشنیع سے اس کا کلیجہ چھلنی کیا کرتے تھے - گھر میں اس کی وقعت ایک کتے کے برابر بھی نہ تھی اگر کپڑے پھٹ کر چیتھڑے ہوگئے ہیں تو ہوجائیں اگر وہ یا اس کے بھائی بہن بھوکے ہیں تو ہوا کریں جب تک گھر کے اور تمام لوگ کھانا نہ کھائیں انہیں کوئی حق نہیں تھا - کہ باورچی خانہ میں قدم رکھیں - وہ ابھی اس تکلیف کو یاد کرکے پھوٹ پھوٹ کر رویا - جب ننھا وحید اور معصوم زبیدہ بخار میں جھلس رہی تھی اور جب تین دن تک اس کی کوئی خبر نہ لی گئی تو محلہ کی ایک عورت سے کچھ پیسے اس کی ماں نے قرض لے کر دوا منگوائی - بچوں کی تیمارداری کے سبب سے دو وقت وہ سب کے لئے کھانا نہ پکا سکی تو اسے اور اس کے بچوں کو کھانا نہ دیا گیا - پھر جب اس کی بہن اور بھائی کی طبیعت کچھ سنبھلی تو فہیم کے بچے کے منقوں کے ڈبے سے بغیر اجازت فہیم کی بیوی کے جب اس نے چند دانے نکال کر اپنے بھائی کو کھلا دیے تو کس قدر اس کی بھاوج اس پر بگڑی اور اس سے کہا - " حرام خوب منہ کو لگ گیا ہے - جوان ہوئے بچے نہیں ہو جاکر کہیں کماؤ، نہیں تو بھیک مانگو خدا کرے میرے بچے کے منقے سنکھیا بنکر لگیں " اور جب اس کی ماں نے منع کیا کہ دولھن تمہارا چھوٹا دیور ہے اس طرح نہ کہو - تو اسے سیکڑوں صلواتیں سنائی گئیں - ہزاروں گالیاں دی گئیں - فہیم اور نعیم دیکھتے رہے اور کچھ نہ بولے - رات کو جب اس کی ماں نے اس سے کہا کہ بیٹے عزیز! کب تک آخر یہ بے حیا زندگی بسر کی جائے گی - تم بھی اپنے باپ کے ترکہ کے حصہ دار تھے لیکن تمہیں کچھ نہ دیا گیا - تمہارے باپ کے مرنے کے بعد جب تک تمہارے بھائیوں نے ہر چیز کو سمیٹ کر اپنا نہ کر لیا اس وقت تک خوب ہماری تمہاری خاطر کرتے رہے - جائداد تمہارے نام بھی ہے لیکن کیا فائدہ جب اس کے مالک و مختار وہی ہیں اور اس سے خود ہی نفع حاصل کرتے ہیں - ہم لوگ ہیں کہ دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیئے گئے ہیں مگر کس سے کہیں کون اپنا ہے - میرے پاس نقدی میں سے ایک پیسہ نہیں ہے ہاں دو چار چھلے پڑے ہیں، تم ان کو بیچ کر سفر کرو یہ تمہارا شہر ہے یہاں تم سے کچھ نہ ہوگا کہ یہاں کے لوگ ایک وقت میں تمہارا عیش و آرام دیکھ چکے ہیں - دوسری جگہ اگر مزدوری بھی کروگے تو تمہارا کوئی جاننے والا نہ ہوگا

اور جب وہ دو مہینہ کلکتہ میں ٹھوکریں کھاتا پھرا لاکھ جتن کیا کہ کسی ہوٹل میں بیرا ہوجائے یا کسی دوکان میں ملازم ہوجائے - لیکن جب اسے کوئی نوکری نہ ملی تو اس نے اپنی ماں کو لکھا کہ میں سخت مصیبت میں ہوں کوئی نوکری نہیں ملتی چار روز سے صرف چنے چبا کر بسر کر رہا ہوں میرے پاس صرف دو پیسے تھے جن سے کارڈ لے کر آپ کو خط لکھ رہا ہوں - جس طرح ہو پانچ روپیہ مجھے بھجوائیے کہ میں آپ تک آسکوں - اور جب اس کی ماں نے رو کر اس کے سوتیلے بھائیوں کی خوشامدیں کیں منتیں کیں اور کہا کہ خدا کے لئے پانچ روپے دو کہ عزیز کو بلا لیا جائے تو اسے دھتکار دیا گیا - اور از راہ تمسخر کہا گیا کہ جس طرح اسے زیور بیچ کر روانہ کیا تھا اسی طرح اب اسے بلواؤ -

میرے یہاں روپیہ پھلتے نہیں ہیں اور نہ میں ایک پیسہ دے سکتا ہوں" چنانچہ اس کی ماں نے اسے اپنا زیور گرو رکھ کے بلوایا

اس نے اپنے دل میں سوچا کہ دنیا کتنی مکار اور اہل دنیا کتنے غدار ہیں آج دو سال کا زمانہ والد کے انتقال کو ہو گیا، لیکن یہ مدت صدیوں سے کم نہیں تھی۔ اس عرصہ میں اتنی مصیبتیں جھیلیں کہ ایک یاد نہیں کاش والد کچھ دنوں اور زندہ رہتے اور مجھے اس قابل بنا جاتے کہ میں کسی کا دست نگر تو نہ رہتا۔ یہ تھے وہ خیالات جو عزیز کو ایک شب لیٹے لیٹے یاد آئے اور وہ اپنی بیکسی پر روتے روتے سو گیا

گذشتہ چھ ماہ سے اس کی بیوہ ماں کے منہ سے خون آرہا تھا شروع میں ایک ماہ تک اتنا خفیف کہ وہ بھی مشکل سے یقین کر سکی لیکن جب ایک دن صبح منہ دھوتے وقت یک بیک کھانسی کے ساتھ بلغم میں خون کے بندھے ہوئے لوتھڑے گرے تو اسے اپنی دکھیاری زندگی سے جلد سبکدوش ہونے پر مسرت ہوئی ـــــ پہلے تو اس نے عزیز سے بھی نہیں بتایا کیونکہ وہ مجبور تھا اور کچھ کر نہیں سکتا تھا، سنکر اسے صدمہ ہوگا۔ لیکن جب ایک دن عزیز کی سوتیلی ماں نے اسے چار پیسے دئے اور اس سے کہا کہ بازار سے مٹی کے برتن لاکر اپنی ماں کے لئے علیحدہ رکھو اس لئے کہ اس کے منہ سے خون آتا ہے اور چھوت کا اندیشہ ہے تو اُسے معلوم ہوا۔ اس نے گھر میں ماں کے علاج کے لئے بھائیوں کی خوشامدیں کیں ہاتھ جوڑے کہ خدا کے لئے اگر آپ لوگ کسی حکیم ڈاکٹر کو نہیں بلاتے تو دس پانچ روپیہ ہی دیجئے کہ میں حکیم کے یہاں اماں کو لیجاکر دکھاؤں۔ لیکن شنوائی نہ ہوئی۔ کہیں سے قرض بھی نہ مل سکا مجبور ہوکر اس نے عطائیوں کے بتائے ہوئے گھاس پھوس پر اکتفا کیا۔ یہ بھی خدا کی مرضی تھی۔ کہ کسی نے اس سے کہدیا کہ وہ ریشۂ برگد بھگو کر زلال میں کچی شکر ملاکر استعمال کراوے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ اور اسے بیحد مسرت ہوئی جب پندرہ روز کے بعد اس کی ماں نے بتایا کہ خون بالکل بند ہوگیا ہے۔ لیکن مہینوں سیروں خون بہ جانے سے اب وہ صرف ہڈی اور چمڑے کا ڈھانچہ رہ گئی تھی کمزور اسقدر کہ چار قدم چلنے میں پیر لڑکھڑاتے اس پر بھی والدۂ فہیم کا اصرار تھا کہ کھانا اگر نہیں پکاتی ہو تو برتن جھاڑو تو ضرور ہی کر دیا کرو

ایک دن شام کا وقت تھا رشید نے کسی بات پر فہیم کے لڑکے کو جھڑک دیا وہ رونے لگا۔ فہیم کی جاہل بیوی کو برداشت کہاں۔ پاس ہی تانبے کا وزنی گلاس رکھا تھا۔ پھینک کر مارا تو رشید کی کلائی پر پڑا وہ رونے لگا۔ غریب ماں برداشت نہ کر سکی منہ سے نکل گیا " دلھن اپنا جیسا بچہ سب کا سمجھا کرو اگر کلائی کے بجائے گلاس سر پر یا اور کسی نازک جگہ پڑتا تو کیا ہوتا۔ میں کمزور مریض ہوں مجھ سے تو تیمار داری بھی نہ ہو لی " اب گویا فہیم کی ماں کی باری تھی اور فہیم کی بیوی ان کے لفظوں کا اعادہ کر رہی تھی۔ " پڑ جاتا کھوپڑی پر، اچھا ہوتا، کھا کھاکے سانڈ ہوا

ہے" اور یہ کہہ کر اُسے مارنے کو لپکیں وہ ڈر کر باہر بھاگا اتفاق کہ باہر سے نعیم آرہے تھے یہ اُن سے ٹکرا گیا - بھلا اُنھیں ایک غریب یتیم بچے کی اس جسارت کی کہاں تاب پکڑ کر اندر لائے - اور جب نعیم کی بیوی نے رو رو کر کہا کہ چھوٹے بچے علیم کو مارا اور مجھے گالی دی تو جہاں تک مار سکے اسے مارا - غریب ماں نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو انھیں ڈانٹ دیا اور کمرے سے اس کا سامان نکال کر باہر صحن میں ڈال دیا - عزیز کھڑا کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا لیکن کرتا کیا - مجبور تھا بیکس تھا - ایک چھوٹے دالان میں اپنا اور اپنی ماں کا پلنگ بچھایا - ایک پلنگ پر خود اور رشید دوسری پر اس کی ماں چھوٹا بچہ وحید اور زبیدہ لیٹی - سردی کا موسم اور رات کو پانی کا برسنا - سرد ہوا سینے میں تیر کی طرح لگتی تھی - جس مصیبت سے ان غریبوں نے رات گذاری خدا ہی بہتر جانتا ہے - صبح کو جب عزیز اٹھا تو اس کی ماں کراہ رہی تھی - پوچھا تو معلوم ہوا کہ سینے میں درد ہے - زبیدہ نے کڑوا تیل گرم کر کے سینہ پر مالش کی لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا

دوسرے دن شام کو سعیدہ اپنے بڑے لڑکے عزیز کو اپنے پاس بٹھا کر دیر تک سمجھاتی رہی پھر کہا " بیٹا مجھے نمونیا ہو گیا ہے میں پہلے ہی کمزور تھی اور اب تو یہ مرض شاید . . . . . . اس کے شدت الم سے اس کی آواز نہ نکل سکی - پھر اس نے کہا - بھیا ! میں موت سے نہیں ڈرتی - اور نہ مجھے مرنے کا افسوس ہے لیکن تم لوگوں کا خیال ہے کہ خدا جانے میرے بعد تم لوگوں کی کیا حالت ہو - خیر جیسی اس کی مرضی ، ہم سب اس کے مجبور بندے ہیں جس طرح چاہے رکھے - میں دیکھتی ہوں جب میری زندگی میں تم لوگوں پر ظلم توڑے جا رہے ہیں ، مصیبتیں ڈھائی جا رہی ہیں تو خدا جانے میرے بعد کیا کچھ تم لوگوں کو تکلیفیں نہ پہنچائی جائیں گی - اس لئے بیٹے ! صبر کرنا اور اس کی رحمت کے منتظر رہنا - دُنیا میں اپنا کوئی ہمدرد نہیں ہے - کوئی عزیز نہیں ہے - اس لئے تم سب کو خدا کے سپرد کئے جاتی ہوں جس حال میں بھی رکھے - ہاں البتہ یہ کرنا کہ عالیہ کو ایک خط لکھ دینا کہ وہ وحید کو اپنے پاس بُلا لیں وہ ابھی بچہ ہے یہاں وہ ظلموں کی تاب نہ لا سکے گا - مجھے امید ہے کہ وہ ان کے پاس آرام سے رہے گا "

عزیز پہلے تو حیران تھا کہ ماں کہہ کیا رہی ہے - اور جب اسے معلوم ہوا کہ میرے زخمی دل پر صبر کا مرہم رکھنے والی میری ہمدرد ، غمگسار اور میری مصیبتوں میں برابر کا حصہ لینے والی ماں بھی مجھکو تین ہستیوں کی ذمہ دار بنا کر دوسرے عالم کو سفر کرنے والی ہے تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا - اور بے اختیارانہ ماں کے سینہ پر گر پڑا

سعیدہ دیر تک بیہوش عزیز کو سینے سے لگائے روتی رہی - جب طوفان اشک کچھ کم ہوا تو زبیدہ کو جو صحن میں بیٹھی ہوئی وحید اور نعیم کے بچے علیم کو کھلا رہی تھی اپنے پاس بلایا ، اور جب وہ آئی تو اس سے کہا کہ مٹی کے ڈھیلے کو تر کر کے بیہوش بھائی کو سنگھائے - وہ غریب حیران کہ نیٹھے بیٹھے بھائی کو کیا ہو گیا - کچھ دیر میں جب عزیز کو ہوش آیا - تو ماں نے ناراضگی کے لہجہ میں کہا - " بیٹے ! میں نے تمھیں صبر کی تلقین کی اور تم نے اتنی جلد اُسے بھلا دیا - دنیا میں

کسے آرام دوائم حاصل ہوا ہے۔ ابھی تمھیں دنیا اور دنیا والوں سے بہت کچھ نصیحتیں اور تلخ تجربے حاصل کرنا ہیں۔ ماشاءاللہ سمجھ دار ہو اگر ابھی سے ہمت ہار دوگے تو تمھارے بہن بھائیوں کا خدا حافظ اس لئے صبر و استقلال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔" پھر عزیز سے کہا کہ کلام مجید لاکر مجھے سناؤ۔ غریب عزیز مجبوری اور بیکسی کی تصویر بنا ہوا اٹھا۔ اور قرآن شریف ماں کے سرہانے بیٹھ کر پڑھنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ الفاظ اس کے منہ سے ضرور نکل رہے تھے لیکن بلا غور کئے اور نہ سمجھے ہوئے۔ اگر اس کے دماغ میں کوئی خیال تھا تو صرف یہ کہ۔ کیا ہونے والا ہے۔ نعیم کی ماں نے کلام مجید غیر وقت پڑھتے ہوئے سنا تو نہ جانے کیا خیال کرکے دالان میں آگئیں ان کے ساتھ ان کی بہو نعیم کی بیوی بھی تھیں۔ محلہ کی دو چار عورتوں نے سنا تو وہ سب دوڑی آئیں۔ دیر تک سعیدہ سب سے اس طرح معافی مانگتی رہی کہ اگر اس نے کسی کے ساتھ اپنی زندگی میں کوئی برائی کی ہو تو وہ اسے معاف کردے۔ چھوٹا بچہ وحید گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ آخر یہ مجمع کیوں ہے۔ آخر وقت تک سعیدہ باہوش حواس سب سے باتیں کیا کی شب میں گیارہ بجے کے قریب یک بیک اس نے کلمہ طیبہ پڑھنا شروع کیا چھوٹے بچے اور بچی کو سینے سے لگا کر رشید کے زخمی ہاتھ کو بوسہ دیا اور چراغ سحری کی طرح گل ہوگئی

(۴)

بدنصیب عزیز اب ہر وقت مغموم رہتا۔ کڑھتا۔ اور تنہائی میں اپنی بیکسی پر زار زار روتا۔ صالحہ بیگم عزیز کی والدہ مرحومہ کے فاتحہ چہلم میں آئی تھیں اور جاتے وقت اپنے ہمراہ وحید کو قصبہ "باڑھ" (جہاں وہ رہتی تھیں اور ان کی جائداد تھی) لیتی گئی تھیں۔ جس وقت صالحہ بیگم نے نعیم کی والدہ سے وحید کو لیجانے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ کسی طرح راضی نہ ہوئیں اور کہا "بیٹا! میں علیم اور وحید کو دیکھ کر جیتی ہوں۔ اگر تم اسے لے گئیں تو میں تو پاگل ہو جاؤں گی تم خود جانتی ہو کہ بچوں سے مجھے کتنی محبت ہے۔" لیکن صالحہ بیگم اس جان لیوا محبت کو خوب جانتی تھیں اس لئے انھوں نے صاف صاف کہدیا کہ چونکہ مومانی کی وصیت تھی کہ وحید میرے پاس رہے اس لئے میں اسے یہاں کسی طرح نہیں چھوڑ سکتی۔ عزیز اپنے بھائی وحید کے جانے سے بہت کچھ سبکدوش ہو چکا تھا۔ پھر بھی اس کی تکالیف میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ اضافہ ہی ہو گیا۔ کیونکہ جب تک اس کی ماں زندہ تھی اس کے اور اس کی بہن بھائیوں کے مصائب میں برابر کا حصہ لینے والی تھی۔ جس بچہ کو تکلیف پہونچتی اسے سمجھاتی۔ بہلاتی۔ حتیٰ کہ اس کا خیال بٹ جانے سے غم مٹ جاتا۔ لیکن اب وہ کیا کرتا؟ اسے اس کا سلیقہ نہیں تھا کہ جب اس کے بھائی رشید پر اس کے سوتیلے بھائی نعیم یا سلیم بگڑیں۔ خفا ہوں۔ اسے گھر سے نکل جانے کی دھمکی دیں۔ یا اس سے اس طرح کہیں کہ "کمبخت پھر بھی جا کہ جھگڑا پاک ہو" تو اس کے مغموم دل کو کس طرح سمجھا دے کیونکر بہلا کر اس کے رنجیدہ دل کو تسکین دے۔ وہ اپنی ماں کی زندگی میں دیکھتا تھا کہ

جب زبیدہ پر گھر میں کوئی خفا ہوا اور اس نے رنجیدہ صورت بنا کر ماں سے شکایت کی تو وہ انھیں یوں کہکر بہلا دیا کرتی تھی "کیا ہوا بیٹا اگر تمھاری بھاوج تم پر ناراض ہوئیں تو خفا ہونے کی کیا بات تمھاری ہی تو غلطی تھی۔ علیم اتنی دیر سے رو رہا ہے کیوں نہ تم نے اسے گود میں لے لیا" لیکن اب . . . . آہ . . . . . . اب نہیں جانتا تھا۔ کہ جب زبیدہ پر کوئی خفا ہو، کوئی جھڑکے اور وہ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے اس کی طرف دیکھے تو وہ اُسے کیا کہکر سمجھاوے۔ اکثر ایسا ہوا کہ جب وہ باہر سے گھر میں آیا تو بہن کو روتا ہوا پایا۔ لیکن اس خیال سے کہ اگر بہن نے مجھ سے کسی کی کچھ شکایت کی تو میں کچھ کہہ نہ سکوں گا۔ وہ دل کو ہاتھوں سے پکڑے ہوئے پھر باہر چلا گیا

اس کا روز کا معمول یہ تھا کہ صبح اٹھ کر ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد بازار سے گھر کا سودا لاتا۔ پھر کچھ دیر بہن کو پڑھاتا دوپہر کو بڑے بھائیوں کو کھانا کھلا کر جو کچھ اسے ملتا خود کھاتا اور اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کو کھلاتا۔ اکثر وہ اپنے دل میں غور کرتا کہ اللہ اکبر جس باپ نے مجھے اس شفقت سے پالا اور پرورش کیا اگر آج وہ زندہ کر دیا جائے اور ہم لوگوں کو آکر دیکھے تو کیا کہے۔ اور پھر اس خیال سے اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ آجاتی کہ تکلیفیں ہمیشہ نہیں ہوا کرتیں کبھی تو راحت اپنا چہرہ دکھائے گی۔ اسے اس کا سخت ملال تھا کہ اس کی زندگی برباد ہو رہی ہے نہ تو اسے تعلیم دی گئی۔ نہ کوئی کام سکھایا گیا۔ اور جب وہ کوئی کام اپنی خوشی سے کرنا چاہتا ہے تو اس کی راہ میں بیسیوں روڑے اٹکا دیے جاتے ہیں۔ وہ سوچا کرتا "آخر مجھے اس طرح بے بس کر کے رکھنے سے بھائیوں کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ شاید یہی کہ گھر میں کوئی نوکر نہیں۔ یا یہ کہ میں ہمیشہ خادم کی طرح ان لوگوں کی خدمت کروں اور یہ ہم لوگوں کی جائداد سے خوب نفع حاصل کریں"۔ اسے بھائیوں کی خدمت سے عار نہ تھا۔ لیکن وہ اس کا حقیر صلہ یہی چاہتا تھا یعنی کہ کسی وقت تو اس کو محبت آمیز لہجہ میں مخاطب کریں کبھی تو اس سے اخلاق سے پیش آدیں۔ لیکن نہیں . . . . . . محبت کا لفظ اس کے نزدیک ایک بے معنی لفظ تھا۔ ایک ایسا مہمل لفظ جس کا صحیح مفہوم دنیا سے اٹھ چکا تھا۔ اور جس کا اطلاق اب خود غرضی مطلب پرستی پر ہونے لگا تھا۔ اُس سے اور اس کی بہن بھائیوں سے محبت کرنے والے دنیا سے اٹھ چکے تھے اور اُسے ان خود غرض دنیا والوں کے مصائب برداشت کرنے کو چھوڑ گئے تھے

جب سے رشید کی ماں کا انتقال ہوا تھا وہ ہر وقت رنجیدہ رہتا۔ اس کی ماں کو دوسرے عالم میں گئے ہوئے چھ ماہ ہو گئے تھے اور اس مدت میں عید اور بقر عید جیسے خوشی کے تہوار بھی گذر گئے لیکن کبھی کسی نے اس کے چہرہ پر مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ کبھی کسی نے اسے ہنسکر بات کرتے نہیں دیکھا۔ وہ روتا بھی نہیں تھا۔ ماں کے

انتقال کے وقت تو خیر وہ دن بھر رویا اور اس کے دوسرے دن بھی۔ لیکن پھر۔۔۔۔؟۔۔۔۔۔ شاید اس کی آنکھوں میں کسی نے آنسو بھی جھلکتا نہیں دیکھا۔ وہ اب سوچا کرتا۔ اسے ہر وقت کوئی خیال رہتا۔ لیکن۔۔۔۔۔۔ اس نے کبھی اپنے خیال کو کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ وہ حد درجہ صابر اور ضابط تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ گھر کے کسی کام کے نہ کرنے کے قصور میں اسے گھر سے نکال دیا گیا۔ دو دو دن تک گھر میں اسے آنے نہ دیا گیا اور اس نے تکئے کی مسجد میں فاقے سے بڑا رہ کر دن گذار دیے۔ اسے نہ تو کھانے کی پرواہ تھی نہ سونے کی فکر۔ اس کا محبوب ترین یہ مشغلہ تھا کہ یا تو وہ گھر میں کسی کپڑے سے منہ ڈھانپے پڑا رہے۔ اور یا کسی ویرانے میں دونوں زانوؤں میں سر ڈالے بیٹھا کچھ سوچا کرے

عزیز کو سخت کوفت ہوتی جب وہ شام کو رشید کو تلاش کرتا اور وہ نہ ملتا یہاں تک کہ اسے ڈھونڈھتا اور لوگوں سے پوچھتا کسی ویرانے یا جنگل میں نکل جاتا جہاں اسے رشید اس حال میں ملتا کہ کسی درخت سے لپٹا ہوا خاموش کھڑا ہے۔ وہ اسے سمجھاتا۔ بہلاتا۔ اور دریافت کرتا کہ آخر اسے کیا تکلیف ہے اور جواب نہ ملنے پر اس کو جھڑکتا اور خفا بھی ہوتا۔ لیکن مظلوم رشید جواب میں اس کی طرف ایک ایسی نظر سے دیکھ لیتا جس میں ایک ہی وقت میں نفرت وحقارت، یاس وحرماں کے جذبات موجزن ہوتے۔ اسے اب کسی سے محبت نہیں تھی وہ اہل دنیا کی بے وفائیوں سے تنگ آگیا تھا۔ درحقیقت وہ اپنی تکلیف کو بھائی سے کیا بتاتا جبکہ اس کے پاس الفاظ ہی نہیں تھے۔ وہ اپنے درد پنہاں کو کیسے دکھاتا جبکہ وہ دکھانے کی چیز ہی نہ تھی۔ اس کی شفیق ماں مرچکی تھی۔ وہ کہ جس نے اس کو بڑی مصیبتوں سے پالا تھا اس کے ہر جا وبیجا ناز اٹھاتی اور ضد پوری کرتی تھی اب دنیا سے جاچکی تھی۔ اس پر ظلم کے پہاڑ توڑے جارہے تھے اور کوئی اسے تسلی دینے والا نہ تھا۔ اس کا دل لعنت وملامت اور طعن وتشنیع کے تیروں سے چھلنی کردیا جاچکا تھا۔ بعض وقت عزیز اس کی بیکسی اور ہر وقت کی خاموشی پر کڑھتا اور اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر رونے لگتا۔ لیکن رشید خاموشی سے اس کے ہاتھوں کو اپنے گلے سے علیحدہ کرکے الگ ہٹ جاتا

(۵)

ہر وقت کی خاموشی نے رشید کی صحت پر بہت بُرا اثر کیا۔ یوں بھی وہ دائم المرض تھا لیکن اب تو اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہوگیا ــــــ رشید عمر میں عزیز سے دو سال چھوٹا تھا۔ اور اب اس کی عمر سولہ برس کے قریب تھی لیکن غم واندوہ نے اسے قبل از وقت مُسن بنادیا تھا۔ عزیز نے اسے لاکھ سمجھایا۔ قسمیں دیں۔ منتیں کیں کہ خدا کے لئے وہ اپنی اس خاموشی کو چھوڑے۔ لیکن اس نے ہر سوال کا جواب ہمیشہ خاموشی سے دیا

ایک روز تمام دن رشید گھر نہیں آیا، یوں بھی وہ گھر بہت کم آتا تھا لیکن آج شام کو بارش ہوجانے سے عزیز

کو اس کی طرف سے تشویش ہو گئی تھی۔ وہ اس کی طبیعت سے واقف تھا سوچا کہ خدا جانے کس ویرانے میں پڑا ہو اس لئے جب بعد مغرب بانی تھما تو وہ اسے ڈھونڈھنے نکلا۔ بمشکل تمام اسے وہ آدھ گھنٹہ کی تلاش میں ایک کھنڈر میں درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا ملا۔ عزیز اس کی روزانہ کی ان حرکتوں سے تنگ آگیا تھا۔ اس لئے اس نے غصہ کے لہجہ میں کہا "آخر رشید تمہارا کیا مطلب ہے، تم کیوں مجھے پریشان کرتے ہو، میرے لئے میری مصیبتیں ہی کیا کم ہیں جن میں تم اور اضافہ کرتے ہو، صبح کے غائب اب اس وقت رات کو تم یہاں مجھے ملے ہو، نہ کھانے کی فکر نہ پانی کی پرواہ۔ کیا جان دو گے؟" رشید نے ایک مرتبہ بھائی کی طرف دیکھ تو لیا لیکن جواب کچھ نہ دیا۔ عزیز نے دوبارہ کہا۔ "بولو رشید تم آخر جواب کیوں نہیں دیتے کیا گونگے ہو، چلو گھر" لیکن رشید اب بھی خاموش تھا گویا وہ کسی کا مخاطب نہیں ہے اور یہاں بالکل تنہا ہے۔ مجبور ہو کر عزیز نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔ "چلو گھر" رشید نے بھائی کے ہاتھ کی گرفت سے اپنے کو آزاد کرتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان آخر آپ مجھے کیوں پریشان کرتے ہیں، آپ جائیے جب میری طبیعت چاہے گی تب آؤں گا" عزیز نے یہ کہتے ہوئے کہ "نہیں تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا" اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ لیکن وہ استقلال سے زمین پر بیٹھ گیا اور دردناک آواز میں کہنا شروع کیا۔

"بھائی جان! مجھے کن کن باتوں میں آپ کی پیروی کرنی پڑے گی۔ گھر جاتا ہوں تو ظالموں سے نجات نہیں ملتی کہیں تنہائی میں بیٹھتا ہوں تو آپ بیٹھنے نہیں دیتے۔" اب اس کی آواز گلوگیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے پھر کہا "ظالموں سے آپ ہی نباہ کیجئے۔ آپ ہی ان کے ساتھ رہئے۔ میری دنیا اجڑ چکی، میرا گھر ویران ہو چکا۔ مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دیجئے کہ میرا مرض لاعلاج ہے۔ میرا اب کوئی رفیق نہیں کوئی شفیق اور ہمدرد نہیں" پھر دفعۃً بھائی کے گلے سے لگ کر وہ رو رو کر کہنے لگا۔ "بھائی جان! آپ کو کس طرح سمجھاؤں جو میرے دل پر گذرتی ہے میں ویرانوں میں مارا مارا پھرتا ہوں کہ کوئی سانپ ہی ڈس لے مگر بدقسمت کو کوئی نہیں پوچھتا۔ دیکھئے...
... یہ دیکھئے..... اور اس نے گلے سے ایک چھوٹی سی تعویذ نما پوٹلی اتارتے ہوئے کہا "آپ جانتے ہیں اس میں کیا ہے؟..... اس میں اماں کی قبر کی مٹی ہے۔ میں اسے چھ مہینہ سے سینہ سے لگائے پھرتا ہوں۔ وہ زندگی میں مجھے اپنے سینے سے لگائے رہتی تھیں تو اب میں اس کی خاک کو چھاتی سے لگائے پھرتا ہوں۔ مجھے اگر کچھ تسکین ہوتی ہے تو اسی سے اور اسی مٹی میں اب ملنا چاہتا ہوں۔ آپ کی..... محض آپ کی لاپرواہی سے اماں نے صدمے اٹھا اٹھا کر اور تکلیفیں برداشت کر کے جان دی۔" اور پھر بھائی کی گردن سے ہاتھوں کو علٰحدہ کر کے وہ پاس کے درخت سے لپٹ گیا اور غصہ سے کہنے لگا۔ "بیشک میں تو یہ کہوں گا کہ اس کی جان آپ نے لی۔ کیوں آپ نے نہ اپنے حقوق طلب کئے اور نہ میرے کیوں نہ آپ نے ان لوگوں سے کہا کہ اثاث البیت اور زمین سے ہم لوگوں کا حصہ علٰحدہ کر دو۔ کیوں آپ یہ کہنے سے خاموش رہے کہ اگر سب نہیں دینا چاہتے ہو تو کچھ تو دو۔ کچھ مہینہ ہی باندھ

دو گز میں ماں کو الگ لے کر رہوں۔ غضب خدا کا جن لڑکوں کے مکان و جائداد کی آمدنی ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ ہو ان کی ماں یوں پیسہ پیسہ کو محتاج ہو۔ جس کی ماں کے ذاتی دو دو مکان ہوں۔ وہ یوں ایک کوٹھری میں سسک سسک کر جان دے۔ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے، آپ نے صبر کیا اور یہ سوچا کہ اللہ میاں آپ کی مصیبتوں کو آپ سے دُور کر دیں گے، تو اطمینان رکھئے کہ خدا ایسا رحیم نہیں ہے کہ بغیر ہاتھ پیر ہلائے آپ کے منہ میں سونے کا نوالہ دیدے۔ جب آپ خود اپنی مدد نہیں کر سکتے تو اسے کیا پڑی ہے کہ آپ کو خاک سے اٹھا کر کانچ پر بٹھا دے"

عزیز کے پاس رشید کے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ دیر تک بیٹھا وہ اپنی حالت پر نفرین کرتا اور روتا رہا پھر اس نے کہا "اچھا میاں جو تم کہو گے میں کروں گا لیکن اب تو گھر چلو۔ بجلی چمک رہی ہے اگر پانی برسنے لگا تو پہونچنا دشوار ہو جائے گا" بمشکل عزیز رشید کو گھر تک لانے میں کامیاب ہوا۔ لیکن مشکل یہ پڑی کہ گھر کا دروازہ نہیں کھولا جا رہا تھا۔ جب چیختے چیختے عزیز کا گلا بیٹھ گیا تو اندر سے جواب ملا "یہاں تمھارا کوئی نوکر نہیں ہے کہ رات کو دس دس بجے جب گھوم کر آؤ تو دروازہ کھولا جائے" زبیدہ آ رہی تھی لیکن عزیز نے باہر سے سنا کہ اسے یہ کہکر ڈانٹا جا رہا ہے کہ "خبردار اگر پلنگ سے اٹھی تو تجھے بھی باہر نکال دوں گی" مجبور ہو کر عزیز و رشید محلے کی مسجد میں شب بسر کرنے چلے گئے۔

(۶)

عزیز کا چچا زاد بھائی "نہال" آرہ میں رہتا تھا۔ وہاں اس کی کپڑے کی دوکان تھی۔ کبھی کبھی وہ پٹنہ بھی آتا اور عزیز سے کہتا کہ وہ اس کے ساتھ آرہ چلے اور وہاں وہ اس کے پاس رہ کر کوئی کام سیکھے اسنے بتایا کہ وہاں اگر وہ ملازمت کرنا چاہے تو قریب ہی "بھیٹہ" کے کارخانہ شکر سازی میں اس کے لئے نوکری کی کوشش کی جائے گی۔ اور یا پھر آرہ میں اس کی ایک موٹر کمپنی کے مالک سے دوستی ہے اس سے کہہ دیا جائے گا کہ وہ اس کو کام سکھائے۔ دراصل نہال کو عزیز سے بیحد محبت تھی وہ عمر میں عزیز سے پانچ چھ برس بڑا تھا۔ لیکن اکثر دیکھا گیا کہ اس نے عزیز کی ایک حقیقی بڑے بھائی کی طرح عزت کی۔ خاندانی ناچاقیوں کے سبب سے نہال جب پٹنہ آتا تو فہیم کے یہاں ٹھیرنے کے بجائے وہ اپنے کسی دوست کا مہمان ہوتا۔ لیکن اسے عزیز اور اس کے بھائی بہن کی تکالیف کی اطلاع ملتی رہتی۔ ایک مرتبہ جب وہ پٹنہ آیا تو اس نے عزیز کو اپنے ساتھ چلنے کے لئے بیحد اصرار کیا۔ اس نے کہا "آخر تمھارے یہاں رہنے ہی سے کیا فائدہ ہے۔ تم اپنے بھائی بہن کی یہاں کون سی مصیبت دُور کرتے ہو۔ سوائے اس کے کہ تمھیں دیکھ کر ان کو کوفت ہو اور انھیں دیکھ کر تم کو صدمہ" اس نے بتایا کہ اگر کوشش کر کے کام سیکھا جائے تو چھ ماہ میں بخوبی موٹر کا کام آ جائیگا۔

اور پھر کام سیکھنے کے بعد کوشش کرنے سے بیسیوں جگہ نوکری مل سکتی ہے۔ چنانچہ جاتے وقت وہ عزیز کو اپنے ہمراہ لے گیا

"آرہ" پہونچ کر عزیز نے موٹر کا کام سیکھنا مناسب سمجھا۔ اور نہال نے بھی یہی رائے دی کہ موٹر ڈرائیوری بہرحال ایک ہنر ہے اور اس کام کو سیکھنے کے بعد ہر شہر میں وہ اس سے نفع اٹھا سکتا ہے۔ لیکن "شکر کا کارخانہ" ہر جگہ نہیں ہوا کرتا۔ چنانچہ عزیز نے اس کام کو سیکھنا شروع کیا۔ وہ صبح اٹھتا۔ نہال اور وہ ساتھ ہی ناشتہ کرکے بازار تک ساتھ آتے نہال اپنی دوکان پر رہ جاتا اور وہ کمپنی چلا جاتا جہاں وہ بارہ بجے تک کام سیکھنے کے بعد گھر کھانا کھانے کے لئے آتا اور پھر کارخانہ جاکر شام تک کام سیکھتا

عزیز کو یہاں آئے ہوئے اب چار مہینہ ہوچکے تھے اور اس کی جانفشانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ موٹر کا کام بخوبی سیکھ چکا تھا۔ اسے بیحد خوشی تھی کہ کوئی دن میں وہ اپنی قوت بازو سے روزی حاصل کرنے کے قابل ہوجائے گا۔ اور تب وہ اپنے بھائی رشید اور بہن زبیدہ کو اپنے پاس لاکر ان کے مغموم دل کو اپنی عملی محبت اور الفت کا ثبوت دے کر گذشتہ صدمات کی تلافی کرے گا۔ جب سے وہ یہاں آیا تھا اسے اپنے بھائی بہن کی کوئی خیریت نہیں معلوم ہوئی تھی۔ اسے وحید کی طرف سے تو اطمینان تھا کہ وہ پھوپھی زاد بہن "صالحہ" کے پاس آرام سے ہوگا۔ لیکن رشید اور زبیدہ ؟ وہ نہیں جانتا تھا کہ میرے آنے کے بعد ان پر کیا کیا ستم ڈھائے گئے ہیں۔ اور اس لئے اکثر وہ متفکر اور رنجیدہ رہتا

ایک دن جب وہ کارخانہ سے دوپہر کو گھر پہونچا تو اُسے اپنے نام کا ایک خط ملا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس نے خط کو جلدی جلدی پڑھنا شروع کیا۔ یہ خط پٹنہ سے اس کے محلے کے ایک ہمسایہ کے پاس سے آیا تھا جو کبھی عزیز کے مرحوم باپ کا دوست تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ "تمھاری چچی (اس کی بیوی) گذشتہ ہفتہ تمھارے گھر گئی ہوئی تھی وہاں سے آنے پر اس نے بتایا کہ رشید بہت بیمار ہے۔ اسے دق ہے۔ پاؤں میں آماس آگیا ہے۔ دست بھی جاری ہیں۔ رشید نے اس سے کہا تھا کہ ایک خط بھائی کو میری حالت کا لکھ دیا جائے۔ اس لئے تمھیں یہ خط لکھا جارہا ہے کہ خط ملتے ہی تم پہلی ٹرین سے یہاں آجاؤ"۔ خط پڑھکر رشید کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہوگئی "یارب! کیا ہونے والا ہے۔ کیا اب بھائی بھی داغ جدائی دے جائے گا۔ آہ...... کیوں نہ ہم سب کو ایک ہی وقت میں موت آجائے کہ کوئی کسی کا صدمہ نہ دیکھے" اس کی آنکھیں ساون بھادوں کا نقشہ پیش کررہی تھیں۔ وہ اپنے دل میں خیال کرتا کہ "ابھی کل تک کیا کیا سبز باغ اپنے بھائی بہن کے لئے تیار کئے تھے۔ کیسا کیسا دل میں خوش ہورہا تھا کہ نوکری ملنے پر اپنے پاس یوں لاؤں گا۔ اس طرح ان کو آرام پہونچاؤں گا۔ اگر وہ مجھ سے کبھی ناراض ہوجائیں گے تو یہ کہکر ان کو مناؤں گا۔ غرض ہر وقت ان کی راحت

و آرام کی مجھے فکر رہے گی۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فلک ستم ظریف کو یہ بھی نہ بھایا کہ اپنے خیالی باغ کی بھی سیر کروں" اس کی چچی (نہال کی والدہ) اسے سمجھا رہی تھی۔ کہ نہال بھی کھانا کھانے گھر آ گیا۔ خط پڑھا۔ اور دیر تک اس کی بدنصیبی پر افسوس کرتا رہا۔ شام کو نہال نے دوکان سے آکر پچیس روپے عزیز کو دیے اور اسے پٹنہ روانہ کر دیا۔ چلتے وقت وہ عزیز کو اسٹیشن تک بھیجنے آیا اور اس سے کہا کہ اگر خرچ کی ضرورت ہو تو تار دے کر اسے مطلع کیا جائے یہاں سے وہ بذریعہ تار روپیہ روانہ کر دے گا۔ اور دیر تک اسے سمجھاتا رہا

پٹنہ سے جب عزیز آرہ آیا تھا تو نہ تو اس نے بھائیوں سے اجازت لی اور نہ ان سے بتایا کہ میں آرہ کس غرض سے جا رہا ہوں۔ وہ خوب جانتا تھا اگر ان لوگوں کی اجازت پر میرا جانا ہوا۔ تو میرا آرہ پہونچنا معلوم۔ یا اگر ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ میں جا رہا ہوں تو میرے راستے میں ہزاروں غار کھود دے جائیں گے۔ اور میں مجبور ہو کر پھر ان کے رحم و کرم پر پڑ جاؤں گا۔ اس لئے جب وہ رشید کی بیماری کا خط پا کر پٹنہ پہونچا تو سب نے اس سے بیزاری ظاہر کی کوئی اس سے مخاطب نہ ہوا۔ نعیم صاحب تو اتنا متاثر ہوئے کہ دوسرے دن وہ کلکتہ گھومنے چلے گئے۔ اس نے رشید کو اس حال میں پایا کہ مرحومہ ماں کا جس جگہ انتقال ہوا تھا اس کا پلنگ پڑا تھا۔ شاید اس نے خود کہکر اس جگہ پلنگ بچھوایا تھا۔ چھوٹی بہن نے بادھ کو بیچ پلنگ سے کاٹ دیا تھا۔ اس لئے کہ اسے ہر وقت دست آیا کرتے تھے وہ بالکل برہنہ چارپائی پر لیٹا تھا اور مرحومہ ماں کا ایک دوپٹہ اس کی ستر پوشی کر رہا تھا۔ لاغر اتنا کہ وہ اپنا سایہ معلوم ہوتا۔ جس وقت وہ گھر پہونچا ہے تو یہ دیکھ کر اس کے آنسو نکل پڑے کہ چھوٹی بہن منہ پھیرے ہوئے اسے استنجا کرا رہی ہے۔ اور گھر کے سب لوگ۔ اس کی ہوا سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ زبیدہ نے اتنا عرصہ کے بعد جو بھائی کو دیکھا تو وہ رونے لگی۔ شاید یہ خیال کر کے کہ میری تکلیفیں بٹانے سے آپ ہی گھبرا کر چلے گئے۔ عزیز نے اسے سمجھایا اور رشید کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے تمام جسم کی روح کھنچکر چہرے میں آ گئی تھی۔ عزیز کو تعجب تھا کہ جب جسم اسقدر نحیف و ضعیف ہو رہا ہے تو چہرہ پر کیوں اسقدر رنگ ہے۔ اس کی آنکھیں اسقدر خوشنما ہو گئی تھیں کہ عزیز دیر تک انھیں دیکھتا رہا۔ اب اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس یاس و ناامیدی کے جذبات نہیں تھے بلکہ اطمینان و سکون، آرام و راحت کی جھلک ان میں پائی جاتی تھی۔ اس کو جسمی تکلیف تو تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ لیکن اس کی روح اپنی آزادی کی جد و جہد میں خوش ہو رہی تھی۔ انتہائی کمزوری کے سبب سے رشید بول نہ سکتا تھا۔ البتہ جب اس کے منہ کے پاس کان لگا کر غور سے سنا جاتا تو کسی قدر آواز سُنائی دیتی۔ مرحومہ ماں کی قبر کی مٹی اب بھی کپڑے میں بندھی ہوئی اس کی کلائی میں بندھی ہوئی تھی

عزیز کو دیکھ کر اس نے کہا۔ بھائی جان! اچھا ہوا کہ آپ چلے آئے۔ میں تو بالکل مایوس ہو چکا تھا لیکن شکر ہے کہ مجھے آخری وقت میں آپ کا دیدار نہ ہونے کا صدمہ نہیں برداشت کرنا پڑا۔ آپ کے جانے کے قبل

ہی سے مجھے حرارت رہتی تھی لیکن میں نے کبھی آپ سے بھی نہیں بتایا کہ آپ کرتے ہی کیا۔ آپ کے جانے کے بعد کچھ دنوں تو میں اس قابل رہا کہ چل پھر سکوں لیکن رفتہ رفتہ میری طاقت مجکو جواب دینے لگی اور آج آپ دیکھتے ہیں کہ میں پلنگ سے بالکل لگ گیا ہوں۔ مجھے اس کی خوشی ہے کہ اب میں اماں سے ملنے جا رہا ہوں اور ساتھ ہی اس کی بھی خوشی ہے کہ آپ کو بھی میری فکروں سے نجات مل جائے گی۔ لیکن خدا کے لئے میرے بعد زبیدہ کو یہاں نہ چھوڑیے گا۔ جب سے میں پڑا ہوں یہ غم میں گھلی جا رہی ہے اور اگر اس کو یہاں کچھ دنوں اور رہنا پڑا تو شاید . . . . اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ رشید نے یہ بھی عزیز سے کہا تھا کہ آج تک میں نے بھائیوں سے کسی قسم کی امداد نہیں چاہی نہ ان کو اپنا علاج کرنے کی زحمت دی۔ اور نہ کبھی یہ خواہش کی کہ میری تیمارداری کریں۔ وحید کے لئے ایک دفعہ ضرور کہا تھا کہ اسے بلوا دیجئے تاکہ اسے بھی ایک نظر دیکھ لوں۔ لیکن جواب میں ہنسکر اس سے کہدیا گیا کہ "آپ ہی نے تو اسے وہاں بھجوایا تھا۔ اور اب یہاں اسے آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ میرے گھر میں اس کا کوئی کام نہیں اور نہ کوئی اسے لائے گا۔" اس کے بعد پھر رشید نے کبھی کچھ نہیں کہا

مسلسل صدمات اٹھانے سے عزیز اب بالکل کھو چکا تھا۔ وہ نہ تو روتا نہ افسوس کرتا ہر وقت چپ بیٹھا ہوا رشید کو دیکھا کرتا۔ اسے پٹنہ آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ آج رشید کی حالت بہت خراب تھی۔ لیکن صبر و استقلال کا مجسمہ زبان سے اُف بھی نہ کہتا۔ برسات کا زمانہ تھا اور دو روز سے ہر وقت بوندا باندی ہوتی تھی جب عزیز آرہ سے آیا تھا۔ تو اس نے چاہا تھا کہ کسی حکیم یا ڈاکٹر کو رشید کو دکھلا دیا جائے لیکن رشید نے خود اس کو منظور نہیں کیا۔ محلہ کے لوگوں نے بھی عزیز سے کہا کہ اس مرض کا مریض برسات میں کم بچتا ہے اور پھر ایسی زار حالت میں اس کو دوائیں پلانا اس پر ظلم کرنا ہے۔ اس کی غذا ہفتوں سے چھوٹ چکی تھی۔ اب صرف پانی ہی اس کی دوا اور غذا تھا۔ کبھی سادہ اور کبھی شربت کی صورت میں عزیز اس کی حلق دو چار چمچوں سے ترکر دیا کرتا

شب کا ایک بج چکا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ پتنگوں کی وجہ سے لالٹین کی روشنی دھیمی کر کے علیحدہ رکھدی گئی تھی۔ آج رشید کی زبان میں قدرت نے جانے کہاں کی قوت گویائی عطا کر دی تھی کہ وہ تمام دن باتیں کرتا رہا۔ رات کو گیارہ بجے تک زبیدہ اس کے پاس بیٹھی رہی اس سے کبھی تو اس قسم کی باتیں کرتا کہ وہ بے اختیار بار بار رو دیتی۔ مثلاً "دیکھو زبیدہ اگر میرے بعد تم روئیں تو میری روح کو بڑی تکلیف ہو گی" کبھی کہتا "سبھی مریں گے پھر اگر میں مرتا ہوں تو کیا نئی بات کرتا ہوں۔ کیا تم ہمیشہ زندہ رہو گی زبیدہ" اور کبھی بالکل بے معنی اور وقت کے لحاظ سے مہمل گفتگو کرتا۔ جیسے "برسات

میں آنکھ سے پانی کیوں برستا ہے" یا "بھائی جان! کون کون ساتھ جائے گا" آخر پریشان ہو کر عزیز نے زبیدہ کو زبردستی وہاں سے یہ کہکر ہٹا دیا کہ کئی روز سے وہ بالکل نہیں سوئی اور یہاں بیٹھ کر پریشان ہو رہی ہے اس لئے جا کر سو رہے

عزیز بھائی بالکل پاس بیٹھا ہوا تھا۔ جب بجلی چمکتی تو اس کی روشنی میں وہ دیکھتا کہ رشید چپ آنکھ بند کئے پڑا ہے۔ شاید اب بھی وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ کبھی اس کی تنفس کی رفتار اسقدر تیز ہو جاتی کہ جیسے دھوکنی چلتی ہے اور کبھی اسقدر سست کہ اس کی طبیعت گھبرانے لگتی۔ اور دل دھڑکنے لگتا۔ وہ خاموش بیٹھا ہوا اپنا رومال آنسوؤں سے بھگو رہا تھا اور سوچتا جاتا تھا کہ کیا مجھ سے بھی زیادہ کوئی اس دنیا میں بیکس ہے، مجھ سے بھی زیادہ کوئی بدنصیب ہے۔ کہ یہاں سے دس قدم کے فاصلہ پر دوسری دالانوں اور کمروں میں لوگ سو رہے ہیں اور میں تھوڑی دیر کے مہمان بھائی کے سرہانے بیٹھا ہوا اس کی سانسیں گن رہا ہوں۔ دفعتہً رشید نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں اور دونوں ہاتھوں سے بھائی کے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ عزیز نے جلدی سے رومال سے آنسو خشک کئے اور یہ جاننے کو کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس کی طرف جھک گیا۔ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ "بھائی جان! میں جا رہا ہوں .... دیکھئے اماں کے .... پاس مجھے دفن کیجئے .... گا .... اور .... اور .... قرآن شریف پڑھکر .... مجھے ..... پھر ایک بارگی وہ اس نقاہت میں بھی کہ اسے بات تک کرنا دشوار تھا۔ عزیز کے دونوں ہاتھ پکڑ کے اُٹھ بیٹھا۔ بجلی چمکی اور اس کی روشنی میں عزیز نے اس کی آنکھوں میں وہ کچھ دیکھا کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے ...... آہ ...... انتہائی یاس و حرماں کی تصویریں اس کی آنکھیں ہو رہی تھیں۔ شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اب آپ مجھے کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ اور پھر اس کے ہاتھوں کی گرفت کمزور ہو گئی۔ عزیز نے جلدی سے اسے لٹایا۔ اور لالٹین کو بھی تیز کر کے اسے دیکھنا چاہا لیکن قسمت کا عتاب کہ جلدی میں وہ بھی بجھ گئی۔ اس نے قلب پر ہاتھ رکھا۔ لیکن ...... اب وہ ...... مٹی ...... ہو چکا تھا

(۷)

عزیز اب عزیز نہ تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح چاروں طرف مارا مارا پھرتا۔ اسے گھر سے بھی کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کا وقت قبرستان میں باپ، ماں اور بھائی کی قبروں کے پاس بیٹھے ہوئے گذرتا۔ عام طور پر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ وہ بھی غم کھاتے کھاتے اپنے بھائی کی طرح مدقوق ہو کر جلدی ہی کشاکش حیات سے چھوٹ جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس لئے کہ دنیا میں مصیبتوں کا نشانہ کون بنتا۔ اس نے کئی بار خودکشی کی کوشش کی کیونکہ اس کا دل زیادہ صدمات اٹھانے کے قابل نہ رہا تھا۔ لیکن عین اس موقعہ پر جب وہ دریا کے قریب پہونچ چکا تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی وحید اور اس کی بہن زبیدہ کی تصویریں آئیں اور اس کو یہ کہکر واپس لے

گئیں کہ آپ کے بعد میرا کیا انجام ہوگا

"نہال" خاندان کی نا اتفاقیوں کے سبب سے پٹنہ نہ آئے - وہ جانتے تھے اگر میں تعزیت میں جاؤں گا تو نعیم کے یہاں ٹھیرنا ہوگا - اور وہاں وہ ٹھہرنا نہیں چاہتے تھے - اس لئے عزیز کو کئی خط روانہ کئے کہ وہ اب "آرہ" چلا آئے - لیکن اسے کوئی خط نہیں دیا گیا - آخر کار ایک ماہ بعد نہال خود آئے - اپنے ایک دوست کے یہاں ٹھیرے اور یہ معلوم کرکے کہ عزیز "گور غریباں" میں ملے گا وہ اس کے پاس چل دئے عزیز اپنی ماں اور بھائی کی قبروں کے درمیان مغموم بیٹھا ہوا تھا

نہال سے برداشت نہ ہو سکا دیر تک عزیز سے مل کر رویا کیا - اور پھر رسم دنیا کے مطابق صبر کرنے کی تلقین کرتا ہوا اسے اپنے ہمراہ اپنے مستقر پر لایا - دو روز تک وہ پٹنہ میں رہا تیسرے دن عزیز کو لے کر اپنے مکان "آرہ" چلا گیا - چلتے وقت اس نے عزیز کو مجبور کیا کہ وہ زبیدہ کو بھی اپنے ہمراہ لے چلے وہاں اس کی طبیعت چچی اور بھاوج سے بہل جائے گی - چنانچہ عزیز نے زبیدہ سے چلنے کے لئے بہت کہا لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوئی - اس نے کہا "بھائی جان! آپ شوق سے جائیے - وہاں آپ نے کام سیکھا ہے اور نہال بھائی کی کوشش سے کہیں نہ کہیں آپ کو نوکری بھی مل جائے گی - لیکن مجھے ساتھ لے جانے کی آپ کوشش نہ کیجئے - میری ماں، باپ، بھائی کی ہڈیاں اس شہر میں دفن ہیں اور مجھے اس گھر کی مغموم فضا سے کچھ انسیت سی ہو گئی ہے - اس لئے میں نہ جاؤں گی - جس طرح بھی ان لوگوں کے ساتھ بسر ہو - ہاں - جب آپ وہاں ملازم ہو جائیے گا - اس وقت آپ چلے آئیے گا میں چلی چلوں گی"

(۸)

عزیز اب بھی کارخانہ میں کام سیکھ رہا تھا - کام تو وہ سیکھ چکا تھا لیکن ابھی اس نے ملازمت کہیں نہیں کی تھی اس لئے مزید احتیاط کی بنا پر یا یوں کہ "بیکار" سے وہ "بیگار" کو مناسب سمجھ کر کارخانہ چلا جاتا شام کو جب وہ اور نہال کھانے وغیرہ سے فارغ ہوتے تو اکثر موضوع گفتگو اس کے مصائب پر ہوتا - نہال کہتا "عزیز! مجھے تعجب ہے کہ تم اتنے دنوں سے میرے پاس ہو لیکن کبھی تم نے اپنے بھائیوں کی شکایت تک نہ کی اپنی بڑی ماں اور بھاوج کا شکوہ تک نہ کیا - کیا تم میں دوسروں کی طرح انتقام کے جذبات نہیں ہیں؟ کیا تمہارا دل بے حس ہو چکا ہے؟" اور وہ جواب میں ایسی ہنسی ہنس کر جس میں رنج کا زیادہ عنصر ہوتا کہتا نہال بھائی! جذبات؟ آپ میرے جذبات کو کیا پوچھتے ہیں - اور میں اس کا جواب کیا دوں جبکہ میں اس کا مفہوم سمجھنے سے عاری ہوں - درحقیقت میرا دل مردہ ہو چکا ہے - اور جس طرح ایک نقش "درد" کی تصویر ہوتی ہے اسی طرح میرے دل کو بھی سمجھئے کہ وہ "درد" ہو کر رہ گیا ہے - رہا انتقام! یہ میرا کام نہیں

ایک مجبور ذات کسی سے انتقام ہی کیا لے سکتی ہے۔ اور بالفرض میں ایسا کر بھی سکوں تو بھی میرے خون شدہ دل کے ذرے اب یکجا نہیں ہو سکتے۔ میں نے اپنے معاملات خدا کے سپرد کر دیے ہیں اور وہی بہتر منتقم حقیقی ہے۔"

گرمیوں میں اس کی بہن زبیدہ کے پاس سے ایک خط آیا تھا۔ اس نے لکھا تھا "بھائی جان! آپ نے وہاں جا کر مجھے بالکل ہی بھلا دیا۔ میں اپنی حالت آپ کو کیا لکھوں۔ اکثر میری ناک سے خون آتا رہتا ہے۔ خیر یہ تو خشکی سے گرمیوں میں اوروں کو بھی آجاتا ہے لیکن کبھی کبھی مجھے ایسا دورہ ہو جاتا ہے کہ میں بیہوش ہو جاتی ہوں اور شاید چیخنے بھی لگتی ہوں۔ اور لوگ تو کہتے ہیں کہ تمھیں "ہسٹریا" ہو گیا ہے۔ لیکن گھر کے لوگ میرے پاس نہیں آتے وہ سمجھتے ہیں کہ شاید کسی جن یا بھوت کا سایہ ہے۔ پرسوں دورہ کی حالت میں میرے سر میں پلنگ کا پایہ لگ جانے سے کچھ زخم ہو گیا ہے۔ کوئی زیادہ گہرا نہیں ہے جلد اچھا ہو جائے گا آپ کوئی فکر نہ کیجئے گا۔ آپ کے دیکھنے کو طبیعت بہت چاہتی ہے اگر دو ایک دن کے لئے آجائے تو بہت اچھا ہو گا" خط کو عزیز نے نہال کو دکھایا اور پھر اس کی رائے سے وہ اپنی بہن کو "آرہ" لے آیا۔ زبیدہ کی صحت بہت خراب ہو گئی تھی۔ لیکن بھائی کے پاس آکر جب آزادی کی سانس لی تو اسے بغیر کسی علاج کے صحت ہو گئی۔ ایک ماہ وہ اپنے بھائی کے پاس رہی تھی اور اس مدت میں وہ اپنی بہترین تندرستی کی حالت میں ہو گئی۔ لیکن ایک دن جب نہال اپنی دوکان اور عزیز کارخانہ گیا ہوا تھا۔ اس کے دونوں بھائی نعیم اور فہیم پہونچے اور زبردستی اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ اس لئے کہ اب وہ تندرست تھی اور گھر کی عورتیں کام کرنے کی عادی نہ تھیں۔ چلتے وقت ایک پرچہ وہ بھائی کے نام چھوڑ گئی تھی۔ جس میں اس نے لکھا تھا "بھیّا مجھے افسوس ہے کہ میں آپ سے مل کے بھی نہیں جا رہی ہوں لیکن کیا کروں مجبوری ہے۔ جب تک میری قسمت میں مصیبتیں جھیلنا ہیں جھیلنے دیجئے۔ اور میرے معاملات خدا کے سپرد کر کے صبر کے ساتھ انجام کے منتظر رہئے"۔ . . . . عزیز جب شام کو آیا تو اس نے رقعہ پڑھا اور صبر کر کے خاموش ہو گیا

یہ ہیں میری زندگی کے وہ واقعات جن کو خدا جانے آج کیوں سپرد قلم کر رہا ہوں، زبیدہ اب بھی بدستور جاگرانہ زندگی بسر کر رہی ہے اور میں اسی طرح بیکار اس درد میں مبتلا ہوں کہ — ہمہ جیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت ما را میں سمجھتا ہوں کہ میری بہن زبیدہ کا بھی ایک دن وہی حشر ہونیوالا ہے جو میرے بھائی اور ماں کا ہوا اور میں اس کے دیکھنے کے لئے بھی زندہ رہوں گا، کیونکہ باوجود ان تمام مصائب کے میں نہایت سخت جان پیدا ہوا ہوں اور سوسائٹی کے وہ تمام مظالم برداشت کروں گا جو مجھ ایسے ہزاروں انسان اس وقت تک برداشت کرتے چلے آئے ہیں اور غالباً ہمیشہ برداشت کریں گے

اسلام

عالم گیر مذہب کی ضرورت

زمانۂ حال میں مذہب کے متعلق جو چند سوالات پیدا ہوئے ہیں اون میں سے دو نہایت ضروری یہ ہیں:-

(۱) مذہب کی اصلاح اس طرح کی جائے کہ وہ زمانہ کی رفتار کے مطابق ہو جائے

(۲) مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں موجودہ اختلاف و تصادم کے بجائے اتحاد و اخوت قائم ہو جائے

مذہب کی ایک تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ اخلاق و اعمال اور عقائد کا ایسا مجموعہ ہے جس کے ذریعہ سے انسان اپنے سے برتر ہستی مثلاً دیو یا خدا کو خوش رکھ سکتا ہے۔ برتر ہستی کو خوش کرنے کے خیال کو چھوڑ کر انسانی بہبودی کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو مذہب کے چند مقاصد نظر آتے ہیں

(۱) انسانی سوسایٹی کے آرام و فلاح کے لئے حُسنِ اخلاق کی تعلیم دینا

(۲) موت کے بعد دوسری زندگی میں کامیاب بنانے کے لئے عبادت و عقائد کی تعلیم دینا

(۳) انسانی جماعت کی اقتصادی معاشرتی اور سیاسی نظام وغیرہ کو بہتر بنانے کی تعلیم دینا

مذاہب کی تاریخ کے مطالعہ سے یا اسلامی نظر سے مذہب کی تعلیم کے دو بڑے حصے کئے جا سکتے ہیں

(۱) مذاہب کی بُنیادی یا مشترکہ تعلیم

(۲) کسی خاص مذہب کی مخصوص یا غیر بُنیادی تعلیم

مذہب انسان کی بھلائی کے لئے آیا ہے اس لئے اُس کو ایسے طریقے اختیار کرنیکی ضرورت ہوئی جس سے یہ مقصود حاصل ہو۔ انسانی سوسائٹی میں کتنی چیزیں بنیادی ہیں جو ہمیشہ قائم رہتی ہیں اسلئے اس کیلئے اسلامی تعلیم کے مطابق سب نبیوں کی تعلیم ایک ہی رہی۔ لیکن انسانی سوسایٹی میں معاشرت سیاسیات اقتصادیات جماعت بندی وغیرہ میں ہمیشہ تبدیلی ہوتی رہتی ہے اس لئے مختلف رسولوں نے ان چیزوں کے متعلق ہمیشہ جدا جدا تعلیم دی ہے۔ گویا اصول یہ ہوا کہ سوسایٹی کی مشترک چیزوں کیلئے مشترک تعلیم اور غیر مشترک چیزوں کیلئے جدا جدا تعلیم۔ خدا اور جنت و دوزخ اور اخلاق وغیرہ کی تعلیم ہمیشہ ہر نبی نے ایک ہی دی ہے، لیکن عبادت کے طریقے سلطنت کے قوانین، جماعت بندی کے اصول وراثت کے قاعدے ہمیشہ زمانے کے بدلنے کے ساتھ بدلے ہیں۔ یہ اصول مذہب کی روح ہیں اور انکی مدد سے آج بھی ہم اپنے مذہب کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ دنیاوی ترقی میں بڑی رکاوٹ ہمارے پُرانے تمدنی و معاشرتی قوانین سے پیدا ہوتی ہے اور

اسلئے اگر ہم مذہب کی روح کو سمجھیں تو اقتضاء زمانہ کے لحاظ سے ان کو بدلدینا ضروری ہے

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ تبلیغ کے دو طریقے اختیار کرتے تھے

(۱) ایک طریقہ یہ تھا کہ غیر مسلمانوں کو مسلمان بنایا جاتا تھا

(۲) دوسرا طریقہ جو بہت ہی کم استعمال ہوا تھا وہ یہ تھا کہ اہل کتاب کو دعوت دی جاتی تھی کہ آؤ ہم اور تم توحید کے اعتقاد پر جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے قائم ہو جائیں

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس طرح بھی تبلیغ کر سکتے ہیں کہ غیر مسلمانوں کو مسلمان بنا کر اپنی جماعت میں شامل نہ کریں بلکہ خدا وغیرہ چند بنیادی عقائد کے ذریعے سے ہم اور وہ ایک اتحاد کے سلسلے میں شامل ہو جائیں۔ یہ طریقے موجودہ زمانے میں ہماری بہت سی مشکلات حل کرنے میں کافی مدد دے سکتے ہیں ——— مذہبی اصلاح کی طرف قدم اٹھایا جاتا ہے تو سب سے بڑی مشکل قدامت پرست عالموں کی طرف سے پیش آتی ہے۔ عالموں کا دعوےٰ ہے کہ وہ وارث انبیا ہیں اور اسلام کو صحیح طور سے سمجھ سکتے ہیں۔ اب یہ دیکھنا چاہئے کہ ان کا یہ دعوےٰ کس حد تک صحیح ہے۔ رسولوں میں ایک طرف علم ہوتا ہے تو دوسری طرف انقلابانہ ذہنیت ہوتی ہے جو وسیع القلبی سے پُر اور تقلید سے دور ہوتی ہے۔ رسولوں کے یہ اوصاف علماؤں میں نہیں ہوتے اسلئے صحیح معنے میں وہ وارث انبیا نہیں ہے۔ کیونکہ رسولوں کے علم سے تو واقف ہوتے ہیں لیکن انکی ذہنیت کا ان میں کچھ بھی حصہ نہیں ہوتا ——— دنیا میں مذہب کی ضرورت تو ہمیشہ ہی رہیگی لیکن افسوس ہے کہ اکثر لوگ مذہب کا حقیقی مقصد نہیں سمجھتے۔ اور مذہب میں سیاسیات اجتماعیات وغیرہ کا جو حصہ ہے اسکو وقت کی ضرورت کے مطابق بدلا نہیں جاتا۔ علاوہ اس مختلف مذاہب کے مقلدین کے پاس کوئی ایک ایسا مرکز نہیں رکھتے جہاں سب جمع ہو جائیں اور مذہبی مغائرت کی جگہ مذہبی برادری پیدا ہو ——— مختلف مذاہب کے اندر اتحاد پیدا کرنے کے لئے ایک مرکز بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ مرکز رسول اللہ کی تبلیغ کے دوسرے طریقے کے مطابق ہو اور ایک نظام کی صورت میں ہو یہ نظام مذہبی صورت میں ہو اسلئے ایک جدید مذہب کا خاکہ بنایا جائے۔ اس مذہب کا نام عالمگیر مذہب ہو۔ اس میں شامل ہونے کیلئے پُرانے مذہب کی جماعت ترک کرنے کی ضرورت نہیں۔ مثلاً ایک مسلمان مسلمان رہ کر اور ایک ہندو ہندو رہ کر بھی اس میں داخل ہو سکتا ہے ——— مولانا شبلی نے علم الکلام میں فطری مذہب کا جو خاکہ کھینچا ہے اس پر ایک نظر ڈال کر اس مذہب کے اصول یوں بنائے جا سکتے ہیں :-

(۱) مذہب کا مقصد دنیا میں یہ ہو کہ عام بنی نوع انسان کی بھلائی مدنظر رکھی جائے

(۲) دنیا کو پیدا کرنے والے ایک خدا کو مانا جائے

(۳) اس زندگی کے بعد بھی دوسری زندگی کا عقیدہ تسلیم کیا جائے

(۴) انسان کو اپنے اعمال کے نتائج اس دنیا اور دوسری زندگی میں بھگتنے ہوں گے

(۵) دنیا کے سب مذہبوں کے بانی اور بزرگوں کو عزت کی نظر سے دیکھا جائے

(۶) ایک عبادتگاہ بنائی جائے جہاں ایک مقررہ طرز پر خدا کی عبادت کی جائے اور سب مذہب کے بانیوں کے نام عزت سے لئے جائیں

(۷) حج کے طور پر سال میں ایک بار اس مذہب کے ماننے والوں کی کانفرنس منعقد کی جائے

(۸) عبادت کا مقصد یہ سمجھا جائے کہ اس سے خود انسان کی بھلائی مقصود ہے

(۹) نیکی سے مطلب نیک کاموں کے علاوہ دولت عزت حکومت حاصل کرنا بھی ہو

(۱۰) اس مذہب میں جو ہندو مسلمان عیسائی یہودی وغیرہ مذہب کے لوگ شامل ہوں ان کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ باہمدگر شادی کر سکیں

(۱۱) اس مذہب کے اصول ہمیشہ انسانی ترقی کی روشنی میں جانچے جائیں

(۱۲) اخلاق کی فہرست میں ایمانداری صبر نرمی بہادری کے علاوہ دنیا میں اتحاد و امن قائم کرنا اور دنیا کے ہر حصے کو ترقی پر پہنچانا بھی ہو

(۱۳) چند اصول کو چھوڑ کر فروعات سے اس مذہب کو واسطہ نہ ہو

(۱۴) اس مذہب کی طرف سے ایک نیا علم "علم فلاح انسان" کے نام سے بنایا جائے اور اس کے ذریعہ سے انسان کی ترقی اتحاد امن اور اچھی سوسائٹی بنانے کے طریقے بتلائے جائیں۔ اس علم کی کتابیں سکولوں میں پڑھائی جائیں۔

آج ہم سیاسیات میں دیکھتے ہیں کہ یورپ نے سیاسی اتحاد پیدا کرنے کیلئے بین الاقوامی انجمن بنائی ہے اور کتابوں میں ورلڈ سٹیٹ (دنیا کی حکومت) کا خیال ظاہر کیا جاتا ہے۔ مختلف قومیں اپنی قومی سلطنتوں کے وجود قائم رکھتے ہوئے بھی بین الاقوامی انجمن کو مان رہی ہیں گویا لوگ دو حکومتوں کے ماتحت آئے ہیں ایک اپنی حکومت اور دوسری بین الاقوامی ــــ یہ طریق کار ہم مذہب میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ اور اس طرح مختلف مذہب کے لوگ اپنی خصوصیت قائم رکھتے ہوئے بھی ایک نظام سے وابستہ ہو سکتے ہیں۔ جس سے مذہبی تصادم کی جگہ مذہبی اتحاد کا جلوہ نظر آئیگا ــــــ اس مذہب کے بنانے میں جمہوری طریقے اختیار کئے جائیں۔ جمہوری سلطنت میں جسطرح سب کی مرضی سے نظام بنتا ہے۔ اسی طرح یہ مذہب بھی اس میں شامل ہونیوالے مختلف مذہبوں کی مرضی اور اجازت سے بنیگا۔ گویا یہ مذہب ایسا ہوگا جس کے بارے میں کہا جائیگا کہ اس کو خود انسان نے غور کر کے جمہور کی رائے کے مطابق تمام دنیا کی بہتری کے لئے بنایا ہے

م - ر - غ

(نگار) آپ کے خیالات میں جس حد تک نیت کا تعلق ہے نہایت پاکیزہ ہیں، لیکن عملاً کس حد تک قابل لحاظ ہیں، اس کے متعلق میں آئندہ اشاعت میں اپنے خیالات پیش کروں گا ــــ اس ماہ کے ملاحظات غور سے پڑھئے، ممکن ہے آپ کی بعض تجاویز کا ذکر اس میں آگیا ہو

(نیاز)

مکتوبات نیاز

آہ ! ــ تمہارا جانا بھی ـــــــ عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

پورے تیس دن اس توقع میں گزر گئے کہ کیا آج کے بعد کل نہ آئے گی اور جب کل آج ہو گئی تو پھر وہی تم۔ تجھے میری ایک نہ سننے والے اور وہی میں تھا تمہاری ضد پر کچھ نہ کہہ سکنے والا! میں نے کہا کہ ایک ہی بار جی لگا کر میری کہانی سُن لو، تم نے ہنس کر ٹال دیا، میں نے التجا کی کہ میری نہیں سنتے تو تمہیں کہہ دو تمہارے جی میں کیا ہے، یہ بھی تمہیں پسند نہ آیا، آخر کار اسی راز دنیا میں یہ فرصت ختم ہو گئی، اور میرے کسی ایک دُکھ کا بھی علاج تم سے نہ ہو سکا..

کیسی کیسی چاندنی راتیں آئیں اور ختم ہو گئیں۔ کیسی کیسی متوالی گھٹائیں آئیں اور گزر گئیں، لیکن ایک دن بھی "ظل کھیلنے" کا بہانہ تم نے ہاتھ نہ آنے دیا۔ میری ناصبوری کی شکایت کرتے ہو، لیکن اپنی بےحسی کا احساس نہیں، میں تنگ ظرف سہی لیکن تمہیں بھی تو دوستی و مروت کا پاس نہیں۔

بہر حال تم مجھے تشنہ و مہجور چھوڑ کر جانے پر نادم ہو یا نہ ہو، مگر یہ سمجھ رکھو کہ

مے باقی و مہتاب باقی ست

مارا بتو صد حساب باقی ست

پھر بولو کہ یہ مطالبہ کب ادا ہو گا، یہ حساب فہمی کس وقت ہو گی۔ کہہ دو "کبھی نہیں" ۔ یہ بھی برحق اور قیامت بھی برحق!

دیکھئے، آخر کار آپ مانے نہیں، اور مجھے پھر ستایا! میں آپ سے کہہ چکا ہوں، شرعی حلف کے ساتھ کہہ چکا ہوں کہ مجھے اُن کے ہاتھ سے آبِ حیات پینا بھی گوارا نہیں، لیکن آپ کا اصرار یہی ہے کہ میں زہر بھی پی لوں ـــ اچھا، مجھے منظور ہے، لیکن ایک شرط میری بھی ہے اور وہ یہ کہ آپ خود آیئے اور مجھے وہاں لے چلئے۔ آپ پوچھیں گے اس کی کیا ضرورت ہے، میں کہوں گا کہ جب آپ ہی جنازہ میں کاندھا دینے کے لئے پاس نہ ہوئے تو مرنے کا کیا لطف ہے۔ آپ ہنسیں گے کہ یہ کیا؟ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہاں جانا واقعی موت ہے میرے اخلاق کی، میری روح کی، میری انسانیت کی اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اس منظر کو دیکھیں اور معلوم کریں کہ فطرت کے خلاف کسی کو مجبور کرنا "قتل انسان" سے زیادہ سنگین جرم ہے، جس کی سزا اگر قانون سے نہیں تو ضمیر کی طرف سے ملنا ضروری ہے۔

باور کیجئے مجھے اُن سے کوئی بغض و عناد نہیں، اور ہو بھی کیسے سکتا ہے، جبکہ میں اپنی بیکسی و بیچارگی اور اُن کی عظمت و شوکت سے پوری طرح واقف ہوں، لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کے سایۂ دیوار میں پناہ لینے کو جی نہیں چاہتا۔

یوں اگر کوئی خدمت مجھ سے اُن کی ہو سکتی ہے تو اسکو انجام دینا میرے لئے سعادت ہے، لیکن وہاں جاکر انہ حاضری دینا اور پھر یہ سُننا کہ اس وقت فرصت نہیں ہے، میرے بس کی بات نہیں ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ غلط ہے، انھیں خبر ہی نہیں ہوئی، در انحالیکہ یہ سب کچھ خود میرے کانوں نے سُنا۔ نہ آپ کو جھوٹا کہہ سکتا ہوں، نہ اُنھیں، اس لئے خود اپنی ہی سماعت پر الزام دیکر خاموش ہو جانا چاہتا ہوں۔ مگر آپ اس پر بھی راضی نہیں۔ پھر کیا مطلب یہ ہے کہ میں اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں، کالا منھ کر کے کسی طرف نکل جاؤں — لاحول ولاقوۃ، معلوم نہیں آپ لوگوں کو اس چھیڑ چھاڑ میں کیا مزہ ملتا ہے۔

براہ کرم آئندہ اس باب میں مجھے کچھ نہ لکھئے، ورنہ میں اس سے زیادہ بداخلاقی کا مجرم ہوں گا، اور آپ سے بھی قطع تعلق کر لوں گا۔

نیاز

صدیقی۔

آپ ملامت کرتے ہیں کہ میں کیوں مسوری سے چلا آیا۔ میں پوچھتا ہوں کہ آپ نے وہاں کا ذکر چھیڑ کر کیوں مجھے تڑپا دیا۔ سنئے، ٹھیک دوپہر کو میں دفتر میں بیٹھا ہوا کام کر رہا ہوں کہ راجپورہ سے ٹیلی فون آتا ہے — "ہم یہاں پہنچ گئے ہیں، لنچ کے بعد روانہ ہوں گے" — یہ وہ خبر تھی جس کے سننے کا میں مہینوں سے منتظر تھا۔ ۲ بجے کا وقت ہے، گہرا ابر چھایا ہے، پہاڑ کی خنک ہوائیں جسم میں سردی لیکن دل و دماغ میں شراب کی سی گرمی پیدا کر رہی کہ دفعتہً بنگلہ کے باہر (ونڈا سٹریم میں میرا قیام تھا) چہل پہل سی معلوم ہوتی ہے اور میں باہر نکلتا ہوں — معلوم نہیں غالب کا "نگار آتشیں رخ سر کھلا" کیا تھا، لیکن یہاں تو وہ ایک سمٹی ہوئی روشنی تھی پیکر انسانی میں، ایک قید کی ہوئی بجلی تھی عالم آب و گل میں، نہ آنکھیں کیمیر سحر بابل، لب "ہمہ خونِ صد میخانہ" — اور اب یہ نہ پوچھئے کہ میں کیا تھا بس یوں سمجھئے کہ جوانی کانٹے پر تُل رہی تھی۔

میں اگر یہ کہوں کہ بیہوش ہو کر گر پڑا تو آپ اسے شاعرانہ مبالغہ تصور کریں گے، لیکن اگر حواس کا تعطل، اعصاب کا استرخاء، جسم کی لرزش اور دل و دماغ کا عدم توازن بھی بیہوشی کا مفہوم رکھ سکتا ہے تو باور کیجئے کہ اسوقت مجھ سے زیادہ دنیا میں کوئی بیہوش نہ تھا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ وہ خاندان ہے جس میں شرفاء فرانس اور دہلی کی خواتین تیموریہ کا خون ایک جگہ آکر ملتا ہے۔ گویا ان دونوں جگہ کے پیکانوں سے ملاکر ایک نئی قسم کا ایسا تیر بنایا گیا ہے جس سے نہ مشرق میں پناہ مل سکتی ہے نہ مغرب میں۔

پھر انصاف کیجئے کہ جس شخص کو ایک دن نہیں، دو دن نہیں، مسلسل چار مہینے اس شعلۂ جوالہ، اس برق بے پناہ کی معیت حاصل رہی ہو، وہ کیونکر اس سے جدا ہو کر زندگی بسر کر سکتا تھا۔

آہ، خورشید خرامید و فروغے بنظر ماند

آپ اس کو ترک ملازمت یا جگہ چھوڑ کر چلا آنا کہتے ہیں حالانکہ یہ کپڑے پھاڑ کر باہر نکل جانا ہے۔ آپ عقل و مصلحت کی دنیا کا ذکر کر رہے ہیں، اور ادھر یہ حال ہے کہ ان سب منزلوں سے گزر کر

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

انتہائی مجبوری و بیکسی میں آپ "اللہ بس باقی ہوس" کہکر خاموش ہو جایا کریں، یہاں تو اب بھی سب پر دعوائے "انا الشرق" ہے اور دل میں وہی آفتاب جلوہ گر۔

ذرا سوچ سمجھ کر بات کیا کیجئے۔ مرتبہ و آداب کا لحاظ رکھ کر گفتگو کرنا سیکھئے — آپ کو معلوم نہیں کہ ہم عاشق ہیں، عاشق!

مشعلِ خورشید بجھ جائے جو نالہ سر کریں

نیاز

عزیزی۔

کیا مکتوب محبت کے زبانی شکریہ ادا کرنے کا بھی اہل نہیں ہوں؟ سچ ہے، جہاں "جانسپاری" کی ضرورت ہو، وہاں صرف جنبش لب کیا کام آسکتی ہے، مگر آپ اسے اعترافِ بیکسی سمجھ کر کیوں نہ قبول کریں۔

معاملات محبت میں تو لوگ اس قدر جری ہو جاتے ہیں کہ

خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

کا نعرہ لگانے لگتے ہیں، میں اگر ایک "بیچارانہ شکریہ" پر قناعت کر دوں تو کیوں موردِ الزام قرار پاؤں۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کا خلوص بے پناہ ہے، جہاں اعترافِ شکست کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

برسات کا ذکر مجھ سے نہ کیجئے۔ جس طرح اس کا پہلا دن بے خبری میں طلوع ہوا ہے، اسی طرح آخری دن بھی ختم ہو جائیگا۔

اے وا دلِ من، صد وا دلِ من

مجھے سوچنے دیجئے کہ آپ کو میرے سفر حیدرآباد کا علم کیونکر ہو گیا۔ کیونکہ اگر خدانخواستہ میں آپ کو دلی سمجھنے لگا تو قیامت ہی ہو جائیگی ہاں "ارتباطِ قلب" کی بات آپ نے خوب کہی۔ اچھا تو یہ بتائیے کہ میں آپ کو کیا دیکھنا چاہتا ہوں؟

بابِ الاستفسار و بابِ المراسلہ میں ایسی تحریروں سے اعتنا ضروری ہے، جب تک مدعا کی تکرار بار بار نہ ہو، لوگوں کے ذہن نشین ہونا دشوار ہے۔ آپ کو میرا مشن معلوم ہی ہے — دیوانہ ہوں، دیوانہ — بکنے دیجئے جو بک رہا ہوں۔ شاید کبھی کوئی کام کی بات زبان سے نکل جائے۔

خوش رہئیے کہ آپ کا وجود میرے لئے خدا جانے کیوں باعث تسکین ہے —

نیاز

محترم۔

آپ کی علالت کا حال تو مجھے معلوم ہو گیا تھا لیکن یہ خبر نہ تھی کہ صورت اس قدر نازک پیدا ہو گئی تھی۔ بارے شکر ہے کہ خطرہ جاتا رہا، نقاہت کا کیا ہے جاتی رہیگی، اور یوں بھی آپ کیا بڑے سام و نریمان تھے کہ ضعف و ناتوانی کی شکایت ہو۔

ہر چند آپ ان ہستیوں میں سے ہیں، جن کو قدرت زیادہ مہلت دنیا میں نہیں دیتی، لیکن معلوم نہیں، کیوں مجھے اسکا یقین ہے کہ آپ ابھی بہت جئیں گے — اس لئے نہیں کہ آپ کے سر بہت سے بندگانِ خدا کا بار ہے، بلکہ شاید اس لئے کہ آپ کا زندہ رہنا ہی خدا کی قدرت کا بڑا ثبوت ہے۔

وہ شخص جو مسلسل ہفتوں کا فاقہ کرے، دو دو دن پانی نہ پئے (شراب کا کیا ذکر ہے) چار چار وقت حجرہ بند کئے پڑا رہے، مہینوں کسی سے بات نہ کرے۔ اس کی زندگی ہی کیا ہے جسے موت آئے گی، اور آئی بھی تو کیا لیجائے گی۔

خدا کے لئے چند دن کے لئے یہاں آجائیے، یہ میرا ذمہ ہے کہ تبدیلِ آب و ہوا سے نہ آپ کے جسم میں ایک انچ کا اضافہ ہوگا اور نہ آپ کے وزن میں ایک تولہ کی بیشی۔ البتہ اُلجھنوں سے دور رہکر ممکن ہے آپ کے دل و دماغ میں کیفیت نشاط پیدا ہو جائے۔

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

اس سے قبل بارہا لکھ چکا تو کیا نتیجہ نکلا، اور اب لکھ رہا ہوں تو کیا ہوگا — عہد کر چکا تھا کہ آئندہ آپ سے مراسلت یکقلم موقوف کر دوں گا

مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

میں یونہی جھک مارتا رہوں گا اور آپ اسی طرح کبھی خاموش رہکر اور کبھی صرف مسکراتے رہیں گے —

نیاز نوازا

اس خلوص و پرسش کا شکریہ — میری غریب الوطنی پر آپ کو رحم آتا ہے اور یہاں بے حسی کہئے یا استغنا، یہ عالم ہے کہ

بحسرت غنچہ ام یعنی بدل تنگیٔ وطن دارم

آپ کے جذبات کا احترام مجھ پر فرض ہے ورنہ میں تو یہی درخواست کرتا کہ آپ مجھے بھلا دیجئے کیونکہ اب جس منزل سے میں گزر رہا ہوں وہ یہی ہے کہ

ما بہ خاطر ہا فراموشی ست دریا ویم ما

نیاز

کسبی

قبل اس کے کہ آپ اس عنوان کو دیکھکر میرے جمالیاتی ذوق پر کوئی حملہ کریں میں آپ سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے کبھی اس امر پر بھی غور کیا ہے کہ "آخر کسبی کو اتنا بُرا کیوں سمجھا جاتا ہے" میرے خیال سے تو ہماری اس نفرت کا سبب شاید قدامت پرستی کی کورانہ تقلید کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ لیکن چونکہ اس سے ہمارے تعقل و ادراک کی انفرادیت پر ضرب پہونچتی ہے اس لئے ہم ذرا شعلہ ریز ہو کر اپنے عقیدہ کو کسی قدر استدلالی بناتے ہوئے یوں کہدیتے ہیں کہ "کسبی چونکہ عصمت فروشی کرتی ہے اس لئے وہ ننگ انسانیت ہے" لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر امعان نظر سے کام لیا جائے تو شاید یہ حقیقت مستتر نہ رہے گی کہ ہماری اس دلیل میں بھی جس کو ہم اختلاف و نزاع سے بہت بلند سمجھے ہوئے ہیں ہمارے ماحول کا فریب اور ہماری سوسائٹی کا اثر و نفوذ بُری طرح کام کر رہا ہے۔ جس طرح عرب کی سوسائٹی نے لڑکیوں کے زندہ درگور کرنے کے انسانیت سوز جرم کو ایک عرصہ تک انسانی غیرت و شرافت کا اعلیٰ معیار بنائے رکھا اسی طرح یہ حقیقت بھی مضحکہ خیز نہیں ہے کہ ہماری موجودہ سوسائٹی کے بعض مستبد فیصلوں کی بنا پر ہم ابھی تک کسبی کی صحیح پوزیشن کو نہیں سمجھ سکے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ اگر تھوڑی سی اخلاقی جرأت سے کام لیکر ہم قدامت پرستی کی عبا اُتار پھینکیں، سوسائٹی کے دباؤ سے متاثر ہوں اور چیزوں کی حقیقت کو ماحول کی عینک سے دیکھنے کے بجائے اپنی بصیرت سے پرکھیں تو ہم کسبی کو اپنے فیصلوں کا افسوسناک شکار سمجھ کر سوسائٹی کے اس استبداد کے خلاف شاید اُس سے کم ماتم نہ کریں گے جو آج فرنچ اکاڈمی کے اُس فیصلہ پر کیا جاتا ہے جس میں میڈیم کیوری کو اکاڈمی کا ممبر بنانے سے صرف اس لئے انکار کر دیا گیا تھا کہ:۔

"اسوقت ہماری قدیم روایات کے ماتحت کسی عورت کا ممبر منتخب کیا جانا نازیبا سمجھا جا رہا ہے جس کا احترام کرنا ہمارے لئے بے انتہا ضروری معلوم ہوتا ہے" [۱]

بہرحال میں چاہتا ہوں کہ آپ اسوقت میرے ساتھ رہکر تھوڑی دیر کے لئے اس موضوع پر خالص علمی حیثیت سے غور کریں۔

---

[۱] ملاحظہ ہو رزولیوشن فرنچ اکاڈمی ۱۹۱۱ء، اس کے الفاظ کا صحیح ترجمہ انگریزی میں یہ ہے:۔

"There is an immutable tradition against the election of women of which it seems eminently wise to respect."

لیکن اس مسئلہ پر بحث کرنے سے پہلے یہ زیادہ ضروری ہے کہ فلسفۂ جرم کو سمجھ لیا جائے [1]

اگر جرم یا گناہ کی نفسیاتی تحلیل کیجائے تو معلوم ہوگا کہ "وہ ایک ایسا فعل ہے جس کے ارتکاب سے خود مرتکب کی ذات پر یا سوسائٹی کے کل یا بعض افراد پر یا کسی ایک واحد ذات پر کوئی مضر اثر مترتب ہو" اور اس لئے منطقی اعتبار سے جرم کی دو تقسیمیں ہوسکتی ہیں، شخصی جرم اور جماعتی جرم، بخل، بدنفسی اور استنکافِ ذات جیسے افعال شخصی جرائم کی تحت میں شمار ہوں گے، اور بازار میں ننگا پھرنا، سرقہ، زنا بالجبر اور دغا وغیرہ کی قسم کے جملہ افعال جماعتی جرائم کی ذیل میں رکھے جائیں گے۔ پھر شخصی جرائم تو بالکلیۃ سارے کے سارے برے ہوتے ہیں۔ لیکن جماعتی جرائم میں سے بعض بذاتہٖ برے نہیں ہوتے بلکہ سوسائٹی کے افراد کی ذہنیت اور اس کے نفوس کے فیصلوں کے مطابق برے قرار دے دئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ممکن ہے کہ کوئی ایک ہی فعل کسی ایک زمانہ میں یا کسی ایک سوسائٹی میں تو جماعتی جرم سمجھا جائے لیکن کسی دوسرے زمانہ میں یا کسی دوسری سوسائٹی میں نہ سمجھا جائے۔ مثلاً مناظر عام پر ننگے پھرنا آج کل ایک جماعتی جرم ہے جس کا ارتکاب نہایت شرمناک اور قبیح امر تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف آج سے ڈھائی ہزار سال قبل یونان اپنی سرسبز و شاداب تہذیب و تمدن کے باوجود ننگے رہنے کو باعث عار نہ سمجھتا تھا [2] دنیا کے قدیم ترین گہوارۂ تہذیب کی حسین ترین دیوی قلوپطرا جب انٹانی سے ملنے اٹلی گئی ہے تو نہ صرف وہ خود ننگی تھی بلکہ اس کی کشتی کو کھینے والی ہر لڑکی کو سراپا عریاں رکھا گیا تھا۔ آج کل بھی جنوبی امریکہ کے بعض حصص میں لوگ ننگے پھرتے ہیں [3] شمالی نائیجیریا میں بنگو ایک مقام ہے جہاں کا یہ عجیب دستور ہے کہ عورتوں کا کپڑے پہننا اس لئے معیوب سمجھا جاتا ہے کہ وہاں کے باشندوں کے نزدیک اس سے ان کے حسن و جاذبیت میں زیادتی ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے جنگجو اور بہادر سپاہیوں کے لئے ان کی طرف رغبت پیدا ہوکر عیاشی میں پڑجانے کا امکان زیادہ قوی ہوجاتا ہے۔

اسی طرح آپ دیکھتے ہیں کہ پارسی فرقہ میں حقیقی بہن سے شادی کرنا کوئی قابل اعتراض فعل نہیں ہے، لیکن اس کے برخلاف دوسری اقوام کے نقطۂ نظر سے یہ چیز انسانی حمیت و غیرت کے سخت منافی سمجھی جاتی ہے۔

یورپ میں دو بیویاں رکھنا خوفناک وحشت و بربریت کا مصداق خیال کیا جاتا ہے لیکن ایشیا میں ایک شوہر کی کئی کئی بیویاں

---

[1] فلسفۂ جرم کی اس تمام تحقیق کی ذیل میں مندرجہ ذیل کتابیں میرے پیش نظر ہیں:-

(1) Crime and its causes, by Morrison (2) Crime Pschyology (3) Psychology of murder by Bjerre. by H. G. Gross (4) Crime, Law and social science, by Michael & Adler (5) A new way with crime by A. F. Brock

[2] ملاحظہ ہو:- Essay on Nudity, by Inea

[3] ملاحظہ ہو:- Essay on Nudity, by Inea

ہونا کوئی بری بات نہیں ہے۔ بلکہ ایشیا کے بعض علاقے تو ایسے بھی ہیں جہاں دو یا تین لوگ ملکر کسی ایک لڑکی سے شادی کر لیتے ہیں۔ اور یہ امر مطلق معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

غرضکہ بہت سے جماعتی جرائم کا حسن و قبح سوسائٹی کے عام رجحان پر موقوف ہوتا ہے۔ اور اسی لئے کسی سوسائٹی کے جماعتی جرائم کی فہرست کو دیکھکر اُس کے افراد کی ذہنیت اور طبعی رجحان کا پتہ چلانا آج کل فلسفۂ تاریخ کا ایک اہم مسئلہ قرار پاگیا ہے۔ اگر کسی سوسائٹی میں سنجیدہ اور ذی ہوش افراد کی اکثریت ہے تو اس کے سارے جماعتی جرائم بھی معقول ہوں گے۔ اس کے برخلاف جاہل اور احمق سوسائٹی کے جماعتی جرائم منطقی علل و اسباب سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ اُن کے بہت سے فیصلے سرتاسر مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔ بہت سے فیصلے ایسے ہوتے ہیں جن کے ہر ہر روزن سے جبر و استبداد کے بھیانک عفریت جھانکتے ہیں۔

پھر چونکہ دُنیا میں بہت کم جماعتوں کی اکثریت ذی عقل و ہوش افراد پر مشتمل رہی ہے اس لئے انسانی تاریخ میں سینکڑوں ایسی مثالیں ملیں گی جن میں لاکھوں بے گناہ افراد سوسائٹی کے ان غیر معقول فیصلوں ہی کی نذر ہو کر زندہ آگ میں ڈالے گئے، کھولتے ہوئے تیل کے کڑاہوں میں پھینکے گئے، جلتی ریت پر لٹائے گئے، جیتے جاگتے زمین میں دفن کیے گئے، خانماں برباد ہو کر جنگلوں میں مارے مارے پھرے، بھوک سے تڑپے اور پیاس سے بلبلائے ۔۔ غرضکہ وہ تمام واقعات جن کے متعلق آج ہم کہہ سکتے ہیں کہ انکی پاداش میں

اس زمیں پر آگ اور پتھر برسنے چاہئیں ‏ ‏ ‏ برق گرنی چاہئے اژدر برسنے چاہئیں

سوسائٹی کے ہی فیصلے ہیں جن کو ہم بعض اوقات کسی ملک کے رسم و رواج سے تعبیر کرتے ہیں۔

پھر یہ صحیح ہے کہ ہماری موجودہ تہذیب اور موجودہ سوسائٹی پہلے کے اعتبار سے بہت بلند ہے اور اس کے فیصلے پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ معقولیت پسند ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود اب بھی بہت سے ایسے فیصلے ہیں جن میں سوسائٹی کا ہاتھ خون سے رنگا ہوا نظر آتا ہے۔ اور بالخصوص ہمارے ہندوستان کی خونریزی تو ابھی اس معاملہ میں بہت بڑھی ہوئی ہے۔

بہرحال فلسفۂ جرم کی اس مختصر سی تحقیق کے بعد اب ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ عصمت فروشی کا وہ جرم جو شدت کے ساتھ کسبی کے خلاف لگایا جاتا ہے آیا شخصی جرم ہے یا جماعتی۔

ظاہر ہے کہ شخصی جرم تو یہ اُسوقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی اسقدر غیر معتدل کثرت نہ ہو کہ مرتکبین کی صحت جسمانی پر اس سے بُرا اثر پڑے۔ اور اس لئے "عصمت فروشی" اُس صورت میں شخصی جرم نہ ہوئی جبکہ اُس کا ارتکاب حد اعتدال سے تجاوز نکرے یا بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ عصمت فروشی بذاتہٖ شخصی جرم نہیں ہے۔ اب اسکی قباحت کی ساری کائنات اس کا جماعتی جرم ہونا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا اسکی قباحت اور شرمناکی کے متعلق سوسائٹی نے جو فیصلہ صادر کیا ہے وہ معقول بھی ہے یا نہیں یعنی آیا فلسفۂ جرم کے اعتبار سے یہ کوئی ایسا جرم ہے جس کا بُرا اثر سوسائٹی کے کل یا بعض افراد پر یا کسی ایک فرد پر پڑتا ہے۔

لیکن اس مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ انفرادی اور اجتماعی اعتبار سے عورت و مرد کے اتصال کی غرض و غایت کیا ہے۔

مختصراً ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ عورت و مرد کے اتصال کی تین اہم اغراض ہیں۔ (۱) بقائے نسل (۲) بچوں کی پرورش، یا تدبیر منزل، اور (۳) آلامِ حیات سے کسی قدر آسودگی۔

ان میں سے پہلی دو اغراض خالص حیوانی اور جبلّی (Instinctive) ہیں۔ اور انسان و حیوان دونوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہیں۔

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ دوسری غرض یعنی بچوں کی تربیت یا تدبیر منزل کا تقاضہ یہ ہے کہ کوئی سے دو مرد و عورت باہم یہ پختہ مفاہمت کر لیں کہ وہ تازیست ایک دوسرے پر اعتماد کریں گے، زندگی کی ذمہ داریوں کو نبیڑنے میں ایکدوسرے کا ہاتھ بٹائیں گے اور رنج و راحت کے ہر موقعہ پر ایک دوسرے کے شریک حال رہیں گے۔

مرد و عورت کی اسی مفاہمت کا نام سوسائٹی کی زبان میں شادی یا نکاح ہے،

جنسی محبت ـــــ جس کی تعریف میں ہمارے ادیبوں، شاعروں، اور فلسفیوں نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دئے ہیں ـــــ کی واحد غرض بھی اسی منزلی زندگی کا قیام و بقا ہے۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ مرد و عورت اپنی منزلی زندگی کے آغاز کے وقت جو عہد باندھتے ہیں، "جذبۂ محبت" اُسی عہد کی پختگی اور توثیق کا ایک فطری ذریعہ ہے۔

یعنی محبت کا جذبہ ایک ایسا قدرتی سیمنٹ ہے جو بچوں کی پرورش یا تدبیر منزل جیسے اہم مقصد کی تکمیل کی خاطر مرد و عورت کے جوڑے کو ایکدوسرے سے شدت کے ساتھ چسپاں رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں یہ سیمنٹ زیادہ مستحکم اور زیادہ شدید ہوتا ہے وہاں منزلی اور خانگی زندگی کا شیرازہ بھی زیادہ منظم اور زیادہ سلجھا ہوا نظر آتا ہے۔

محبت کا یہ جذبہ بعض جانوروں میں بڑی شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے[1]۔ چنانچہ ہندوستان کا سارس اور آسٹریلیا کے ایک خاص قسم کے طوطے جن کو "طیور محبت" (Love birds) کہتے ہیں اس سلسلہ میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔

منزلی زندگی کے قیام و بقا کے لئے جو چیز سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے وہ یہ ہے کہ مرد و عورت اپنے تناسلی تعلقات میں ایک دوسرے کے ساتھ وفادار رہیں، تاکہ بچوں کی پیدائش پر اُن دونوں میں سے ہر ایک اُن کی پرورش کرنا اپنا فرض سمجھے ورنہ بصورت دیگر اگر عورت و مرد میں تناسلی تعلقات کی اس تحدید کے متعلق کوئی مفاہمت نہ ہو تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ مرد اپنی "بیوی" کے بچہ کو یقینی طور پر اپنا بچہ نہ کہہ سکیگا اور اس لئے کسی حیثیت سے اُس کی پرورش اور تربیت میں عورت کا ساتھ دینے کو تیار نہ ہوگا جبکہ

---

[1] اس بحث کی بعض دلچسپ تفصیلات کے لئے مندرجہ ذیل تصانیف ملاحظہ ہوں :-

(1) Animal ways, by Baulenger (2) Animals in the wild and captivity, by Balenger (3) Animals of all countries, by Hutchinson.

لازمی نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان کی منزلی زندگی تباہ ہو جائے اور اُس کے ساتھ ساتھ اُس کے حیات اجتماعی کے تار و پود بھی بکھر کر رہ جائیں۔

تناسلی تعلقات کے متعلق اسی مفاہمت کا نام سوسائٹی کی اصطلاح میں "تحفظِ عصمت" ہے اور اس مفاہمت کی خلاف ورزی کرنا بے عصمتی اور بے حیائی،

اگر آپ عورت و مرد کے اتصال پر ایک مرتبہ اور نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اگرچہ "تحفظِ عصمت" کا تعلق بلاواسطہ تدبیر منزل سے ہے لیکن چونکہ بقائے نسل اور بچوں کی پرورش یا تدبیر منزل دونوں مقاصد لازم و ملزوم کی سی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ عورت و مرد کے اتصالِ جنسی کی پہلی دو اہم اغراض کے قیام و بقا کے لئے عورت کے واسطے تحفظِ عصمت سخت ضروری ہے[۱]

اب تک ہم جس نتیجہ پر پہونچے ہیں وہ یہ ہے کہ ہر اُس عورت کے لئے عصمت دری ایک عظیم جماعتی گناہ ہے جس کی زندگی کے مقاصد میں بقائے نسل اور تربیت اولاد داخل ہوں۔ لیکن ہم بتا آئے ہیں کہ عورت و مرد کے اتصال کے یہی دو سبب نہیں ہیں بلکہ ایک تیسرا مقصد اور بھی ہے جس کے ماتحت وہ دونوں زندگی کی تلخکامیوں کو کسی قدر فرخندگی کے ساتھ برداشت کرنے کے اہل ہو جاتے ہیں۔ یعنی مرد و عورت کے اتصال کا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ وہ سوسائٹی کو بچے دئے جائیں اور پھر اُن کی پرورش کرتے رہیں۔ بلکہ اُس کی ایک اہم غرض یہ بھی ہے کہ اس طرح وہ خود بھی تھوڑی دیر کے لئے زندگی کے آلام و انکار سے بے نیاز ہو کر ایکدوسرے میں کھو جائیں، اور اُن کا یہ اتصال کچھ عرصہ کے لئے اُن کو اس عالم آب و گل کی مفلوج کن بندشوں سے چھڑا کر اُن کے دماغ میں نشاط و سرور کی ایک نئی روح پھونکدے اور جس طرح ایک رومانی نظم (Romantic poem) ہم کو اس دُنیا کی کثافتوں سے بہت دور عیش و کامرانی کی کیف آور جنت میں پہونچا دیتی ہے اسی طرح مرد و عورت کا اتصالِ جنسی بھی اُن کو زندگی کی اِن گرانباریوں سے سبکبار کر کے لطف و مسرت کے اُس سبزہ زار میں لیجاتا ہے جہاں پہونچکر وہ بچوں کی طرح بیفکر ہوتے ہیں اور چڑیوں کی طرح خوش۔

اس موقعہ پر میں اس خیال سے کہ کہیں آپ میرے مقصد کے خلاف اِس "لطف و مسرت" کو کوئی اور "حیوانی مفہوم" نہ دیدیں یہ کہدینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہاں مسرت سے میری مراد صرف وہ مسرت ہے جو عاشق کو نیاز میں اور محبوب کو ناز میں محسوس ہوتی ہے، وہ مسرت جس کو نظیری اس طرح ادا کرتا ہے:۔

چہ خوش ست از دو یکدل سر حرف باز کردن — سخنِ گذشتہ گفتن گلہ دراز کردن

اثرِ عتاب بُردن ز دلِ ہم اندک اندک — بہ بدیہہ آفریدن بہ بہانہ ساز کردن

گزشتہ زمانہ میں عورت و مرد کے اتصالِ جنسی میں اس چیز کو زیادہ اہمیت نہیں۔ بجا تھی اس لئے کہ اُس زمانہ میں زندگی کے مسائل اتنے اُلجھے ہوئے نہ تھے جتنے اب ہو گئے ہیں جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ پہلے کی بہ نسبت آج کل ہماری دماغی ترقی بہت بڑھی ہوئی ہے

[۱] "عورت" کی تخصیص یہاں صرف اس لئے کی گئی ہے کہ اسوقت ہمارا موضوع بحث صرف "عورت کی عصمت" ہے۔

جس کی بنا پر روزمرہ زندگی کے تنوعات میں اتنا اضافہ ہوگیا ہے کہ وہ فطرت کے سادہ اُصولوں سے ہٹکر بہت پیچیدہ ہوگئے ہیں اور اسی لئے اب جبکہ تمدن و تہذیب کی ترقی نے ہر انسانی دماغ کو بے پناہ طور پر مصروفِ عمل بنا رکھا ہے اور جبکہ زندگی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اپنے تمام آلام و افکار کو جلو میں لئے ہوئے دُنیا میں نازپاشیاں کر رہی ہے — تو فطرتاً "سکون" کی احتیاج میں بے انتہا اضافہ ہوگیا ہے پہلے دماغی محنت کے مقابلہ میں جسمانی ورزش اور دماغی لیاقت و استعداد کے مقابلہ میں جسمانی طاقت و قوت بہت زیادہ وقیع سمجھی جاتی تھی اور اس لئے دماغی سکون کی "مانگ" کم تھی[1] لیکن اب جبکہ ہر شخص کم و بیش تعلیمیافتہ ہے، دُنیا کا ہر قطعہ دوسرے قطعہ کے ساتھ تار، لاسلکی، ریلوں اور جہازوں سے جکڑا ہوا ہے، ہر شخص اخبار پڑھتا ہے اور فرانس میں رہکر جاپان کی جنگ کے امکانات کو سوچ سوچ کر گھلتا رہتا ہے — دماغی سکون کی "صدائے طلب" سے دُنیا کا گوشہ گوشہ گونج اُٹھا ہے،

ایسی حالت میں ایک معقول سوسائٹی کا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ ہر اُس چیز کا خیر مقدم گرمجوشی سے کرے جس سے عوام کو سکونِ دماغ حاصل ہوسکے۔

اس قدر بحث کے بعد اب غور کیجئے کہ کسبی کے وجود کا مقصد کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ بقائے نسل اور تدبیرِ منزل اُس کے مقاصد سے خارج ہیں اس کے بعد اُس کا واحد مقصد جو کچھ رہجاتا ہے وہ یہی ہے کہ تھکے ہوئے دماغوں کو سکون اور مجروح روحوں کو راحت پہونچائے۔ یعنی عورت و مرد کے جنسی اتصال کی صرف تیسری غرض کی تکمیل کرنا اُس کی زندگی کا مقصد ہے۔ اور اس لئے ظاہر ہے کہ "عصمت ریزی" کا "اجتماعی جرم" جو ایک منزلی اور خانہ دار خاتون کے لئے شدید طور پر شرمناک ہے ایک کسبی کے حق میں کوئی جرم نہیں رہتا۔

کسبی کے پیشہ کی واحد غرض "اتصال مرد و زن" کے ابتدائی دونوں مقاصد (یعنی بقائے نسل اور تدبیرِ منزل) کو نظر انداز کرتے ہوئے اُس کے صرف تیسرے مقصد یعنی "آلامِ حیات سے کسیقدر آسودگی" کو تقویت پہونچانا ہوتی ہے۔ وہ صرف اسی تیسری غرض میں خاص مہارت بہم پہونچاتی ہے اور گویا اس طرح انگریزی اصطلاح میں اس فن کو (Specialise) کرتی ہے۔ وہ صرف نغمہ و رقص ہی کی ماہر نہیں ہوتی بلکہ "اختلاطِ مرد و زن" کے اہم مسئلہ کو ایک آرٹ بناکر اپنی ساری زندگی اس شریف مقصد[2] کی تکمیل کے لئے وقف کر دیتی ہے۔ وہ "اتصال زوجین" کی اسی تیسری غرض کو اپنی حیات کا ایک مستقل موضوع بناکر دنیا کے سامنے لطف و انبساط کا دستر خوان چنتی ہے، وہ عشوہ و کرشمہ کے باریک ترین نکات کا گہرا مطالعہ کرتی ہے، حُسن اور حُسن کی جاذبانہ کشش کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتی ہے اور پھر اپنی تحقیقات کے ہر ہر جزو کو انسانی زندگی کے ساتھ تطبیق دینے کی کوشش کرتی ہے۔ جس سے دوچار ہونے کے بعد کائنات کی ساری فضا میں قوسِ قزح کے سے لطیف رنگ بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں، سانس کی ہر آمد و شد میں نکہت و لطافت کی

---

۱ مقتبس از "بک آف نالج" (Book of Knowledge) طبع دوم

۲ شرف ہر علمے یا بہ مناسبتِ موضوعِ آنست یا بجلالتِ غایت و منفعت یا بوثاقتِ برہان و حجت" (اخلاق جلالی مطبوعہ نولکشور صفحہ ۳)

ایک دنیا جلوہ نمائی کرتی ہے اور آواز کا ہر وہ تار جو ہوا میں ارتعاش پیدا کرتا ہے کوثر و تسنیم کی اُن رنگین موجوں کی نازک لہروں کے مشابہ ہوتا ہے جس کی ایک ایک جنبش کے ساتھ موسیقیت کے سینکڑوں ساز نغمہ ریز ہوتے ہیں۔

ان اُمور کو پیش نظر رکھتے ہوئے غالباً اب آپ میرے اس خیال سے اختلاف نہ کریں گے کہ کسبی کے پیشہ کا منتہائے مقصد عقلی اور منطقی اعتبار سے جُرم نہیں ہے، اس لئے کہ فلسفۂ جرم کے اعتبار سے نہ تو اس پیشہ سے خود کسبی کی ذات پر کوئی برا اثر پڑتا ہے اور نہ سوسائٹی پر، پھر اگر اعتدال پسندی سے ہٹ جانے کی بنا پر یا بعض خارجی عوارض کی وجہ سے سوسائٹی پر کبھی اس کا بُرا اثر مترتب ہوتا ہے تو اس سے نفس پیشہ کے وقار پر کوئی صدمہ نہیں پہونچنا چاہئے۔ اس کی مثال بالکل اس طرح سمجھئے جیسے اگر کوئی وکیل یا طبیب اپنے پیشہ سے ناجائز فائدہ اُٹھانے لگے تو اس کے یہ معنے نہ ہوں گے کہ وکالت یا طب کا پیشہ بذاتہٖ ذلیل سمجھ لیا جائے۔ پھر ہر پیشہ کی شرافت و رذالت کا معیار اُس کے بنیادی اغراض کی شرافت و بلندی کے اعتبار سے قائم کیا جاتا ہے اور اسی لئے وکالت کو ایک شریف پیشہ سمجھا جاتا ہے اگرچہ ۹۰ فیصدی حالات کے ماتحت وکلاء مقدمات کی پیروی میں حق پرستی سے اعراض کرتے ہوں۔ اسی طرح کسبی جس کے بنیادی مقاصد میں رقص و سرود اور سرور آفرینی شامل ہے اپنے مقاصد کے اعتبار سے کچھ کم بلند نہیں ہے۔

بہرحال یہ ممکن ہے کہ بعض پست "پیشہ ور" کسبیاں بری ہوں۔ لیکن اس سے بلند رقاصاؤں پر الزام نہیں آنا چاہئے۔ یہ بالکل اسی طرح ہو جیسے نفسِ ملازمت کے اعتبار سے وائسرائے بھی ملازم ہے اور عدالت کا ادنیٰ چپراسی بھی، لیکن اس کے باوجود دونوں میں اختلاف و افتراق کا ایک عالم حائل ہے۔

پھر جس طرح ایک جاہل یا غیر مہذب طبیب بھی ہمارے لئے ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک بد مذاق اور جاہل مغنیہ کے مسئلہ میں بھی سوسائٹی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اُس کی جہالت اور بدوضعیت کی بنا پر اُس کو حقارت کی نظر سے دیکھے لیکن ایک سنجیدہ اور تعلیمیافتہ مغنیہ کا مرتبہ کسی حیثیت سے بھی ایک بلند پروفیسر یا ایک اچھے شاعر سے کم سمجھنا ہماری اخلاقی کمزوری کی کچھ کم نفرت انگیز مثال نہیں ہے۔

عصمت فروشی کے بعد سب سے اہم چیز جو مغنیہ کے پیشہ کے خلاف بڑی شدت کے ساتھ پیش کیجاتی ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ:

"وہ محبت کے شریف جذبہ کا بہت غلط استعمال کرتی ہے۔ اس لئے کہ محبت کے الوہی جذبہ کے نام پر بازار میں بیٹھکر ہر کس و ناکس سے چار پیسے مانگنا فطرت کے اس لطیف جذبہ کی زبردست ترین توہین کرنا ہے نیز اپنے اُس جمالیاتی احساس کے خلاف بھی ایک عظیم بغاوت ہے جو فطرت کی طرف سے ہم کو ودیعت کیا گیا ہے"۔

اس اعتراض کی ساری بنیاد محبت کے اُس عجیب و غریب تخیل پر ہے جو خیالی افسانوں، شعراء کے دیوانوں یا ادیبوں کے مضامین کے سوا عملی دُنیا میں کہیں نہیں پایا جاتا پھر گو اس "الوہی جذبہ" کے متعلق کتنی ہی مبالغہ آرائیوں اور بلند پردازیوں سے کام کیوں نہ کیا جائے لیکن جب آپ اُس کی خالص فلسفیانہ تحلیل کریں گے تو اس کا مرتبہ اُس طاقتور فطری مابہ الاتصال سے زیادہ ثابت نہ ہوگا جو انسان کی منزلی زندگی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اور اس بنا پر جہاں منزلی زندگی کے ماتحت اُس معاہدہ کا

سوال ہی نہ پوچھے سوسائٹی کے عرف میں "شادی" کہتے ہیں وہاں محبت کا سوال بھی قطعاً بے محل ہو جاتا ہے۔

پھر خوشنما پھولوں سے، لہلہاتے ہوئے سبزہ زار سے، برستی ہوئی گھٹا سے، پرکیف فضا سے، ماں، باپ اور بھائی بہن سے بھی ہم کو محبت ہو سکتی ہے لیکن جس طرح اُس کی نوعیت زوجین کی محبت سے سراسر مختلف ہوتی ہے اسی طرح رقاصہ سے بھی محبت ہو سکتی ہے لیکن اُس کی نوعیت بھی عام جنسی محبت سے مختلف ہوگی۔ جس طرح حسین کوئل کی "پکار" میں وہ لطافت اور کشش تلاش کرنا جو آپ کی بیوی کے حلقوم سے نکلے ہوئے گانوں میں ہوتی ہے ایک مضحکہ خیز مطالبہ ہوگا اسی طرح ایک کسبی سے بیوی جیسی محبت طلب کرنا حماقت و نادانی کی کچھ کم افسوسناک مثال نہ ہونا چاہئے۔

بہرحال جب بقائے نسل اور تدبیر منزل مغنیہ کے بنیادی مقاصد سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے تو پھر اُس میں اُس مابہ الاتصال یعنی زناشویانہ محبت کا فقدان بھی جو خالص منزلی زندگی کی پیداوار ہے، کسی حیثیت سے قابل الزام قرار نہیں پا سکتا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ کسبی جسکو ہم اپنی زبان کا کثیف ترین لغت سمجھتے ہیں اور جس کے مختلف ناموں کو ہماری سوسائٹی دنیا کی بدترین گالی سمجھتی ہے کیوں ہماری نظر عتاب کا اس درجہ غیر معقول سبب بنی ہوئی ہے اگر سوسائٹی کے فرد یا مجموعہ افراد کو اپنے اندر جذب ہونے کا استحقاق دینا نہیں چاہتی تو اس کا سب سے پہلا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ اُس فرد یا اُس مجموعہ افراد کو اپنے اس ارادہ اور نیت سے مطلع کر دے۔ لیکن اگر اس کے علی الرغم وہ اُس فرد یا اُس مجموعۂ افراد کو برقرار رکھنے کیلئے سہولتیں بہم پہونچاتی رہے گی تو اس کے کھُلے ہوئے معنے اس کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ اُس کے خلاف ہر وہ نفرت جس کا اظہار سوسائٹی کی طرف سے کیا جاتا ہے شرمناک طور پر منافقانہ اور ریاکارانہ ہے۔

اگر مطربہ اور مغنیہ کو ہماری سوسائٹی نفرت و حقارت کا مستحق سمجھتی ہے اور وہ اس پیشہ کو قوم کے معاشرتی مفاد کے حق میں مضر تصور کرتی ہے تو پھر وہ اس پیشہ کے بقا کے لئے چندہ کیوں دیتی ہے ؟ اگر قوم کے اس عضو کو وہ کاٹ ڈالنے کے قابل سمجھتی ہے تو پھر وہ اُس کے تغذیہ میں اتنی گہری دلچسپی کیوں لے رہی ہے ؟

ہر مغنیہ کی سربفلک عمارتیں اور فردوس نما پائیں باغ ہمیں سوسائٹی کے اس منافقانہ فیصلہ کی جانب بار بار توجہ دلاتے ہیں۔

پھر اگر رقاصگی کا پیشہ قابل نفریں ہی ہے تو رقاصہ سے زیادہ ہر وہ مرد سزا اور سرزنش ہونا چاہئے جو اُس کے کوٹھے پر چڑھتا ہے۔ اگر سوسائٹی "پیشہ ور" کو بُرا سمجھتی ہے تو صرف اسی لئے کہ وہ اپنی عفت کو سربازار فروخت کرتی ہے۔ اور اس لئے اگر الزام کی ساری کائنات یہی ہے تو اس کے برخلاف ہر وہ مرد مستحق عتاب ہے جو اُس کی گلی میں نظریں اُٹھائے پھرتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا کسبی کو ذلیل نظروں سے دیکھنے کے بجائے ہر اُس مرد کو قابل تشنیع نہ سمجھا جائے جو اُس کے یہاں سوسائٹی کے زعم کے مطابق یہ "شرمناک سودا" کرتا دکھائی دے ؟

پھر سوسائٹی کا یہ فیصلہ کس اعتبار سے قابل تسلیم قرار دیا جا سکتا ہے کہ زنا کا ارتکاب مرد کے لئے تو زیادہ شرمناک نہ ہو لیکن جب عورت کا سوال آئے تو یہی معصیت اُسکی معاشرتی زندگی کے سارے جوڑ بند بُری طرح کھول کر رکھدے ؟

آخر اخلاقی یا معاشرتی زندگی کے فلسفہ کے اعتبار سے زنا کے مسئلہ میں مرد و عورت کا یہ امتیاز حق بجانب سمجھا جا سکتا ہے؟

بہر حال ان تمام حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے مندرجۂ ذیل منطقی نتائج نکالے جا سکتے ہیں:۔

۱۔ حقیقتاً سوسائٹی کسبی کو عصمت فروشی کی بنا پر قابل عتاب قرار نہیں دیتی ورنہ مرد کو بھی اُتنا ہی ذلیل سمجھا جاتا۔ اسکے برخلاف اس عتاب کا اصلی سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ چونکہ اسوقت تک عورت کو مرد کی ملکیت سمجھا جاتا رہا ہے اس لئے رقاصگی کے پیشہ کی خود اختیاری اور وقار نفس کو دیکھکر سوسائٹی کو یہ ڈر پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اور عورتوں میں بھی خود اختیاری اور وقار نفس کا خیال سرایت کر جائے اور اس طرح مرد کو اپنے اس اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑے۔

۲۔ سوسائٹی رقاصگی کے فلسفہ سے ناواقف ہے اور چونکہ باپ دادا سے ہمیشہ اس کے خلاف کتھائیں سنتی چلی آ رہی ہے، اسلئے قدامت پرستی کے جذبہ کے ماتحت اُس کے دل میں کسبی کے خلاف نفرت و عناد کا بے بنیاد جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔

۳۔ اگر کسبی کے وجود سے سوسائٹی کے کسی اہم مقصد کی تکمیل نہ ہوتی تو دنیا کے اور بہت سے ناکارہ پیشوں کی طرح سے یہ چیز بھی یا تو بالکل ختم ہو جاتی یا دُنیا میں خال خال نظر آتی۔ لیکن اس کے برخلاف سوسائٹی کے نفرت و اکراہ کے باوجود مغنیہ کا سرسبز ہونا بتلاتا ہے کہ سوسائٹی کو مغنیہ کی ضرورت ہے اگرچہ وہ نہ جانے کہ اس ضرورت کی بنیاد کن اُمور پر ہے۔

الغرض میں سمجھتا ہوں کہ ان اُمور کو پیش نظر رکھنے کے بعد رقاصہ کی صحیح حیثیت بہت کچھ واضح ہو جاتی ہے۔ اور اس لئے کتنا افسوسناک ہے یہ امر کہ ہم نے ابتک اُس کی بلند معاشرتی پوزیشن کو سمجھنے میں بیدردانہ تجاہل سے کام لیا ہے۔ لیکن اگر ہماری حقیقت ناشناسی کا یہ عالم کچھ دن اور باقی رہا تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس غلطی کا ردعمل۔ سوسائٹی کی کسی صف کو اُلٹ کر نہ رکھدے۔ فقط

سید ابوسعید بزمی بھوپالی۔ بی۔ اے

مجموعۂ استفسار و جواب شائع ہوگیا

اس رسالہ میں آپ کو ایک عنوانات کی فہرست ملے گی۔ جس کے مطالعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مجموعہ کس قدر ضروری اور اہم مباحث پر مشتمل ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ اسکا مطالعہ ہر شخص کو کرنا چاہئے بلکہ ہر گھر میں اس کا موجود ہونا ضروری ہے۔ حجم ۱۲۵ صفحات۔ قیمت ۸؎ مع محصول خریداران نگار سے ایک آنہ روپیہ کم لیا جاتا ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

یہ یونیورسٹیاں

ہمنے بچوں کو ایک کھیل کھیلتے دیکھا ہے۔ وہ کھیل یہ ہو کہ ایک بچہ بڑھیا بنتا ہے اور لکڑی لیکے جھکا جھکا بڈھوں کی طرح چلتا ہے۔ دوسرا بچہ اس سے پوچھتا ہے "بڑھیا۔ بڑھیا۔ کیا ڈھونڈتی ہے" بڑھیا جواب دیتی ہے "سوئی"

سوال:۔ سوئی لیکے کیا کرے گی۔

جواب:۔ بٹوا سیونگی۔

سوال:۔ بٹوا لیکے کیا کرے گی۔

جواب:۔ روپئے رکھوں گی۔

سوال:۔ روپئے رکھ کے کیا کرے گی۔

جواب:۔ گائے لوں گی۔

سوال:۔ گائے لیکے کیا کرے گی۔

جواب:۔ دودھ پیوں گی۔

سوال کرنے والا بچہ کہتا ہے "دودھ نہیں موت پئے گی" اس پر لکڑی لیکے بڑھیا اس کے پیچھے دوڑتی ہے، اب سب لڑکے شریک ہو جاتے ہیں اور "دودھ نہیں موت" چلانے لگتے ہیں، اور بڑھیا ہر ایک کو لکڑی مارنے کی کوشش کرتی ہے۔

یہی کھیل ہم اس مضمون میں یونیورسٹیوں سے کھیلنا چاہتے ہیں اور پوچھتے ہیں۔

یونیورسٹی۔ یونیورسٹی کیا ڈھونڈھتی ہے؟

یونیورسٹی:۔ روپیہ۔

ہم:۔ روپیہ لیکے کیا کرےگی۔

یونیورسٹی:۔ پروفیسروں کو بھاری بھاری تنخواہیں دوں گی انکو چین عیش اور کاہلی کی زندگی بسر کراؤں گی۔

ہم:۔ پروفیسر کیا کریں گے۔

یونیورسٹی:۔ پروفیسر قوم کے لڑکوں کو مہینہ میں تین چار گھنٹے اگر دل چاہا پڑھا دیں گے اس کے بعد اپنی شان وشوکت دکھائیں گے وائس چینسلر اپنے بڑھاپے کا زمانہ چین وعیش سے گزارے گا۔

ہم:۔ لڑکے اس یونیورسٹی میں پڑھ کے کیا کریں گے۔

یونیورسٹی:۔ قوم کو ترقی دیں گے۔

ہم:۔ ترقی نہیں ٹھینگا دیں گے۔

ہمارے اس کہنے پر وائس چانسلر۔ پروفیسر۔ ریڈر اور لکچرار ہمیں مارنے دوڑیں گے اور ہم یہی کہے جائیں گے۔

ہمیں یہ بتاؤ کہ ان یونیورسٹیوں نے ہندوستان کی ذہنی سطح کتنی بلند کی؟ کس مقدار میں ذہن خلاق ان یونیورسٹیوں نے ہندوستان میں پیدا کیا۔ ملک کی زندگی کے مسائل کے حل کرنے کی کتنی طاقت یونیورسٹیوں سے لیکر طالب علم نکلے اور کتنی ہمت وجرأت کے ساتھ اسے استعمال کیا۔

وہ یونیورسٹی جو اپنے طالب علموں میں خیال کرنے کی قوت اور عمل کرنے کی جرأت نہ پیدا کرے۔ وہ یونیورسٹی جس کے

طالبعلموں کی ذہنی طاقتیں ۲۵ء میں وہی ہوں جو ۲۰ء میں تھیں اور ۳۵ء میں وہی رہیں جو ۳۰ء میں تھیں، اسکے معلموں کو باوجود ان کے علم و تبحر کے طوق لعنت پہنایا جائے تو بہتر ہے۔ معلم وہ ہے جو اپنے دماغ کی قوت متعلم میں منتقل کرے۔ کسی نہ کسی طرح متعلم تک پہونچائے معلم کی شان پیغمبر کی ہونا چاہئے اس کو جو فیض ہوا ہو اسے متعلمین پر منتقل کرے یونیورسٹی کا کام یہ ہے کہ متعلمین کا دماغ (خلاق) بنائے۔ اگر اس نے یہ نہ کیا تو کچھ نہ کیا۔ یونیورسٹی طوطے پڑھانے کی جگہ نہیں ہے۔ یونیورسٹی چراغ سے چراغ روشن کرنے کی جگہ ہے۔

اس صوبۂ ممالک متحدہ آگرہ واودھ میں پانچ یونیورسٹیاں ہیں، سوسائٹی کے لئے ذہنی قوت کی مقدار کسقدر ہر سال ہمکو ان یونیورسٹیوں سے حاصل ہوتی ہے۔ کتنے نئے خیال ان یونیورسٹیوں نے پچھلے دس سال میں پھیلائے سوسائٹی کی کتنی خرابیاں ان یونیورسٹیوں کے متعلمین نے دور کیں۔ نئی دنیا بنانے میں ان یونیورسٹیوں کے نوجوانوں نے کیا اور کتنی سعی کی

ہم نے اپنے گرم خون اور تازی جان والے نوجوان یونیورسٹیوں کے سپرد کئے تھے اُنھیں کیا بناکے اُنھوں نے ہمیں واپس کیا۔ ان یونیورسٹیوں کی شاندار عمارتیں کیا قوم کی ذہنی طاقتوں کے مقبرے ہیں جن میں وہ دفن کیجاتی ہیں۔ پچھلے دس برس میں دس ہزار جوان گریجویٹ یونیورسٹیوں نے نکالے ہونگے دس ہزار گرم خون والے نوجوان جس سوسائٹی میں ہوں اور وہ سوسائٹی جس جگہ پر تھی اُسی جگہ پر رہے۔ دس ہزار تازی جان رکھنے والے نوجوان جس سوسائٹی میں ہوں وہ سوسائٹی اپنی اصلاح نہ کرسکے۔ دس ہزار نوجوان! اور سوسائٹی کی خرابیوں کا رونا۔ دس ہزار یونیورسٹیوں کے نکلے ہوئے نوجوان اور فرسودہ اور پست خیال والوں کی حکومت اور جرأت سوسائٹی میں قائم رہے۔ دس ہزار یونیورسٹیوں میں پلی ہوئی جانیں سوسائٹی میں موجود ہوں اور سوسائٹی کے ذہن کی سطح وہی ہو جو دس برس اُدھر تھی۔ دس ہزار ڈائینامو اور کرنٹ ندارد واہ ری یونیورسٹی۔ وا رے یونیورسٹی کے معلم اور واہ رے یونیورسٹی کے طالب علم۔

یونیورسٹی کا کام یہ ہے کہ متعلمین کے دماغوں کو وسیع کرے ابھارے اور بلند کرے انھیں یہ محسوس کرائے کہ انسانی کوششوں نے عالم کے کیا کیا راز کھولے ہیں۔ ہر شاخ علم کے حدود کیا ہیں اور کیا واسطہ اور رابطہ ایک علم کا دوسرے علم سے ہے۔ وہ حقیقتیں جو علوم سے منکشف ہوئی ہیں، ان کا تعلق انسانی زندگی سے کیا ہے انسانی مجبوریاں اور اس کی طاقتیں کیا ہیں۔ انسان نے کیا کیا۔ کیا اور جو کچھ کیا کس طرح کیا۔ فرد کا جماعت سے کیا تعلق ہے۔ جماعت کی مضبوطی افراد سے کس طرح ہوتی ہے۔ انسان کی کمزوریاں کیا ہیں افراد اور جماعتیں کس طرح ان کمزوریوں سے اپنے کو پست کرتے کرتے فنا ہوجاتی ہیں۔ یہ کمزوریاں کس طرح دُنیا سے دور ہوں اور ہوسکتی ہیں خلاصہ یہ کہ یونیورسٹی کا کام یہ ہے کہ متعلم کے دماغ کو حقیقت جو بنائے اور ہر چیز کے اصلی حدود سمجھنے کی طاقت پیدا کرے علم اور صنعت یعنی فطرت اور انسانی طاقت کے جو اجزا انسانی زندگی میں ہیں انھیں الگ الگ سمجھ سکے

یہ عمل جب انسانی ذہن کے ساتھ کیا جاتا ہے تو وہ (خلاق) ہونے لگتا ہے۔ بات میں بات پیدا کرتا ہے۔ ایک خیال کو دوسرے خیال سے ملا کے تیسرا خیال پیدا کرنے کی قوت اس میں ہوجاتی ہے۔ ایک خیال کو نئے حالات پر استعمال کرنے کی استعداد اور قدرت وہ پیدا کرلیتا ہے۔ اس کو اپنے اوپر اعتماد ہوتا ہے جس سے ہمت وجرأت پیدا ہوتی ہے یہی چیزیں انسانی زندگی کے آدکار ہیں

کیا یہ یونیورسٹیاں زندگی کے آلات کار اپنے متعلمین کو فراہم کرتی ہیں۔ یا صرف یہ سکھاتی ہیں کہ دفتروں میں نوکری کے لیے عرضیاں لئے گھوما کرو۔ کسی پیشہ میں داخل ہو تو اس کو بجائے بلند کرنے کے پست کر دیئے یونیورسٹی کے متعلمین انڈین سول سروس اور انڈین پولیس سروس میں اب آئے ہیں۔ لوگ انکی بابت کیا کہتے ہیں؟ جو کچھ ہم نے سنا ہے اور جو کچھ ہم جانتے ہیں اس کی بنا پر یونیورسٹی کی تعلیم تعریف کی مستحق نہیں ہے۔

یہ معلمین یونیورسٹیوں کے کیا کرتے ہیں اس کا بھی کوئی دیکھنے والا ہے ان کے نتائج کار تو ہمارے سامنے ہیں ان سے ان کے کام کی خوبی تو نظر نہیں آتی۔ وہ ہی امتحانات وہ ہی متعلمین کی ذہنی سطح، پھر ان یونیورسٹیوں پر اتنا روپیہ صرف کرنے کی ضرورت کیا ہے۔

تھیوسیڈائڈ باشندگان اتھنیس کی بابت لکھتا ہے :۔

"ہم اتھینی حسن کے عاشقوں میں ہیں مگر ہمارے مذاق میں سادگی ہے اپنے ذہن کی تربیت مردانگی کو بغیر ضائع کئے ہم کرتے ہیں۔ دولت کا صرف ہم لاف اور نمائش کے لئے نہیں کرتے ناداری ہمارے یہاں ذلت نہیں ہے بلکہ حقیقی ذلت اسمیں ہے کہ ناداری سے بچنے کی کوشش نہ کیجائے۔ اتھینی باشندہ یعنی ملکی سیاست سے بے پرواہ اور بے خبر نہیں ہوتا اگر وہ کاروبار میں بھی مشغول ہے تب بھی سیاست کے متعلق معقول واقفیت اور خیال رکھتا ہے۔ ہم اتھینی اس شخص کو جو سیاست کے متعلق خیال نہیں رکھتا اور سیاسی معاملات میں دلچسپی نہیں دکھاتا۔ ایک بے مصرف آدمی سمجھتے ہیں۔

کیا علمار یونیورسٹی اپنے طلبار کے لئے یہ نمونہ زندگی پسند کرتے ہیں۔ کیا ان کی زندگی بھی اسی نمونہ کی ہے اگر نہیں تو کس نمونہ کے نوجوان تم پیدا کرنا چاہتے ہو۔ علمار یونیورسٹی بالتم کس طرح اِن مولویوں اور پنڈتوں سے بہتر ہو جن کی مذمتیں تمھارے ورد زبان ہیں۔ وہ قدما کی سکھائی ہوئی باتیں دہراتے اور اپنے شاگردوں کے دماغوں میں ٹھونستے ہیں تم جدید یورپ کی تصانیف رٹتے ہو اور اپنے طالبعلموں کے دماغوں میں بھرتے ہو۔ کیا گیٹے کا مشہور مقولہ تمنے سنا ہے "حقایق عالم جن کا علم ہمیں پڑھنے یا سننے سے ہو ان کا انکشاف از سرنو ہمیں کرنا پڑتا ہے" جس کے یہ معنے ہیں کہ پڑھکے یا سُن کے کوئی خیال اور کوئی حقیقت انسان کے ذہن کی ملکیت اسوقت تک نہیں ہوتی جب تک یہ محسوس نہ ہو کہ اس کو اس نے خود دریافت کیا یعنی قوت فاعلی اس پر صرف کی ہے۔ یونیورسٹی کا کام نوجوانوں میں فصل کرنے والا ذہن پیدا کرنا ہے۔ جو خیال اُس کے ذہن کے سامنے پیش کیا جائے اُسے اپنا کرے اور یہ ذہنیت خلاق ذہن پیدا کرنے کا، ہمیں بتاؤ دماغ کی اس قسم کی تربیت کے لئے ہماری یونیورسٹیوں میں کون طریقے اختیار کئے جاتے ہیں سب سے بہتر طریقہ خیال پیدا کرنے اور حقیقت کو منکشف کرنے کا گفتگو ہے ان یونیورسٹیوں میں یہ طریقہ کس حد تک استعمال ہوتا ہے۔ سقراط نے کوئی کتاب نہیں تصنیف کی کوئی نظام فلسفہ نہیں مدون کیا۔ وہ حقیقت جو تھا اور اپنے خیالات کو گفتگو کر کے خود بھی فائدہ حاصل کرتا تھا اور دوسروں کو بھی مستفید کرتا تھا اپنے اس طریقہ تعلیم سے کتنے حقیقت جو دماغ اُس نے پیدا کر دئے یونانی فلسفہ حقیقت میں ان دماغوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جنھوں نے اپنے چراغ سقراط کے چراغ سے روشن کئے تھے، درسگاہوں کا طریقہ افلاطون نے قائم کیا اور پہلی درسگاہ یونان میں افلاطون کی اکادمیہ تھی۔ لیکن اس اکادمیہ سے

افلاطون دوسرا افلاطون نہ پیدا کر سکا جیسے سقراط نے افلاطون پیدا کیا تھا۔ درسگاہوں میں تعلیم لکچر دیکر کر سکتے ہو بحث و مباحثہ کرکے نہیں دیسکتے۔ لکچر اور کتابیں متعلمین کے دماغوں کو مرعوب کردیتی ہیں ان کو اُبھرنے سے روکتی ہیں۔

سقراط نہیں ہو سکتے ہو نہ سہی لیکن وہ طریقے تو برت سکتے ہو جو وہ برتتا تھا۔ وہ فضا تو اپنے گرد پیدا کرنے کی کوشش کر سکتے ہو جو وہ پیدا کرتا تھا۔ یونیورسٹی حقیقتاً سقراطی فضا پیدا کرنے کی جگہ ہے۔ تم افلاطون کی طرح لکچر دینے کا شوق رکھتے ہو مگر سقراط کی طرح مسئلہ کے حل کرنے میں متعلمین کی مدد کیوں نہیں کرتے تاکہ متعلم تمھارے چراغ سے اپنا چراغ جلائے۔ یونیورسٹی کسی نظام خیال کی تعلیم دینے کی جگہ نہیں بلکہ ہر نظام پر بحث کرنے کی جگہ ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں مسلمات کی گنجایش نہیں۔ یہ رد و قدح کی جگہ ہے۔ یہاں ذہنی اشیاء کی تحلیل و ترکیب ہوتی ہے۔ کیا ان یونیورسٹیوں کے دس ہزار تلامذہ کے دماغ اسی کام کے لئے تیار کئے گئے ہیں؟ ملک کی زندگی کے کتنے مسائل پر اپنی ذہنی طاقتیں انھوں نے استعمال کیں اور نہیں استعمال کیں تو کیوں کیا کسی مسئلہ کا حل درکار نہیں ہے۔ یہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھنا کیا معنے۔

اس کی ضرورت ہم تم کو بتائیں۔ یونیورسٹیوں سے تم دس ہزار گریجویٹ کیا سیکھ کے آئے ہو۔

یہ جو کچھ ہم نے کہا وہ حقیقتاً یونیورسٹیوں سے کہا۔ اب ہم دو دو باتیں یونیورسٹیوں کے طالبعلموں سے کرنا چاہتے ہیں۔

یہ یونیورسٹیاں ہماری نسل کے لوگوں کی بنائی ہوئی نہیں ہیں بلکہ ہم سے بھی پہلی نسل کے لوگ اس کے بنانے میں شریک تھے ہمارا اور ہم سے پہلے والا جنریشن ہندوستان کا یورپ اور انگلستان کے اُنیسویں صدی کے خیالات کا فضلہ نوشش جنریشن تھا۔ تمھارے اساتذہ بھی ظاہر ہے کہ اسی جنریشن کے لوگ ہیں۔ ان سے بہت زیادہ امیدیں تمھیں نہ رکھنا چاہئیں۔ ان میں بہت سے علم و تجربہ والے لوگ ہیں لیکن تمھارے ذہنوں اور قلبوں کو جس آگ کی ضرورت ہے وہ ان میں ہے ہی نہیں تم تک کیا پہونچائیں گے ان سے ان کے ذہن کے بغیر سلگے کوئلے لو۔ ممکن ہے خود تمھاری دبی ہوئی آگ ان کو سلگا دے اور یہ بھی دہکیں اور پھر تم بھی دہک اُٹھو۔ لکچرار سے لیکر ریڈر اور پروفیسر تک کسی کو آرام نہ لینے دو۔ ہر وقت ان سے کہو کہ تم ہمیں ذہنی کشتیاں لڑنا سکھاؤ۔ اسی کی تم تنخواہ پاتے ہو۔ ہندوستان کی زندگی کی اُن سے کہو تصویر بنا کے پیش کریں تم اُس کے ہر جزو پر رد و قدح کرو اگر بری تصویر پیش ہو اسپر مضحکہ کرو۔ ہندوستانی زندگی کے ہر پہلو پر ذہنی نقطہ نظر سے غور کرنے کا نہ صرف تمھیں اختیار ہی بلکہ اسپر غور کرنا تمھارا فرض ہے۔

پروفیسروں کو اتنی مہلت نہ دو کہ وہ اپنی بیویوں یا پرائی بیویوں میں بیٹھ کے وقت ضائع کریں۔ کلاس روم کے بعد ان کا زیادہ وقت طلبا کی صحبت میں صرف ہونا چاہئے۔ پروفیسر ہمہ وقت ان ڈیوٹی ہے تم اپنی جگہ یونیورسٹی کو محکمہ نہ بننے دو۔ اسے اپنے ذہنوں کے پلنے بڑھنے کی جگہ بناؤ۔ تمھاری زندگیاں گورنمنٹ اسکولوں اور انٹرمیجیٹ کالجوں میں پہلے ستیاناس کر دی جا چکی ہیں وہاں تم ایسے ہاتھوں میں آتے ہو۔ جنھیں ہمہ وقت اپنی تنخواہوں کی فکر ہوتی ہے۔ جن کا رجحان مدرسہ کو مثل دیگر سرکاری محکموں کے ایک محکمہ بنا دینے کی جانب ہوتا ہے ہمیں موجودہ گورنمنٹ اسکولوں کا کافی تجربہ ہے۔ اور اسی تجربہ کی بنا پر یہ کہنے کی ہم جرأت کرتے ہیں کہ گورنمنٹ اسکولوں کی فضا ذہنی لطافت سے اسدرجہ خالی ہوتی ہے کہ اللہ کی پناہ

... رسین کی ذہنیت ادنےٰ سے لیکے اعلیٰ تک وہی ہوتی ہے جو پٹواری سے لیکے ڈپٹی کی ہوتی ہے۔ طالبعلموں خدا کے لئے یونیورسٹی میں پہونچکر گورنمنٹ اسکولوں کی زندگی کو بھلا دو۔ اگر یہ زندگی تمھیں یونیورسٹی میں بھی یاد رہی تو سوائے گورنمنٹ ملازمت کے تم کسی مصرف کے نہ ہوگے اور گورنمنٹ میں ملازمین کی جتنی بلند زندگی ہوتی ہے اس کو اگر جاننا چاہتے ہو تو کسی ضلع میں ان لوگوں کی صحبت میں ایک ہفتہ رہو۔ تم اگر صاحب مذاق ہو تو تمھارا دم گھٹنے لگے گا اور یہ محسوس کروگے کہ کسی بند کمرے میں بٹھا دئے گئے ہو اور دل چاہتا ہے کہ دروازہ کوئی کھولدے تاکہ ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا آجائے۔

ٹیگور نے کہا ہے جب بچہ جنم لیتا ہے تو خدا اس کے کان میں کہتا ہے اے انسان میں تجھ سے نا امید اور بددل نہیں ہوا ہوں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر انسان نئی غرض خداوندی پوری کرنے کے لئے آتا ہے ایک نیا پیام عالم بالا سے لیکر آتا ہے بقول ٹینیسن یہ کہتا آتا ہے "پرانی ترتیب بدلتی ہے اور اپنی جگہ نئی کو دیتی ہے۔ خدا کی مرضی پوری ہونے کے بہتیرے ڈھنگ ہیں" اپنے دل میں یہی سمجھو کہ یونیورسٹی کے ذریعہ دُنیا میں نئی جان ہم پھونک رہے ہیں۔ جو چیز آنے والی ہے اس کی شکل بنانے میں مصروف ہیں اپنے پیام کو موزوں شکل دینا چاہتے ہیں تاکہ دنیا دلچسپی سے سنے۔ دنیا کے ساتھ بیاہ کرنے کے لئے دولھا بن رہے ہیں۔ یہ اسٹاف یہ پروفیسر ہیں سجانے بنانے کیلئے ہیں براہ خدا اپنا یہ طرز عمل بدلو کہ تم میاں مٹھو ہو اور تمھارے اُستاد تمھیں پڑھا رہے ہیں۔ میاں مٹھو سسٹم آف ایجوکیشن غلط اور بالکل غلط ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تم پڑھتے اور سیکھتے ہو لیکن یہ غلط ہے کہ کوئی دوسرا تمھیں سکھاتا ہے، معلم کا انداز طبیعت تو یہی ہو کہ میں پڑھاؤں اور سکھاؤں لیکن متعلم یہ نہ سمجھے کہ وہ سکھایا جارہا ہے اور وہ یہی سمجھے کہ اُستاد بخل کر رہا ہے اور وہ زبردستی اس کے پاس جو کچھ ہے اسے چھین رہا ہے اُستاد کے لئے متعلم رہزن و ڈاکو ہو جو کچھ اُس کے دماغ میں ہو اُسے لے لے۔ ایک آخری بات کان میں کہنا اور پوچھنا چاہتا ہوں بکسر میں مہاتما گاندھی کے ساتھ سناتن دھرمیوں نے جو کچھ کیا وہ تم نے سنا ہوگا۔ اس شرمناک واقعہ کی ذمہ داری یونیورسٹی کے گریجویٹ پر کچھ عائد کرتے ہو یا نہیں۔ ان گریجویٹس نے تعصب، پست خیالی، وہم پرستی بلند اور اعلیٰ خیال سے نفرت، پُرانے فرسودہ خیالات سے اسدرجہ رغبت کہ جان ان پر قربان کرنے کو تیار، ان حالات کی اصلاح کے لئے کیا کیا۔ تمھارا کیا قصد ہے۔ جمود، پستی اور کنسرویٹزم پر اپنے کو بھی قربان کردگے۔ ہمیں بتاؤ تمھارا کیا قصد ہے۔؟

(معلومات)

عبدالوالی بی۔ اے

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

جس قدر اہم کتاب ہے۔ اس کا اندازہ مطالعہ کرنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس کی بہت کم جلدیں رہ گئی ہیں۔ اس لئے جلد آرڈر دیجئے۔ ورنہ ممکن ہے دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے۔ قیمت غیر مجلد ؎ مجلد ۳؎ (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ

باب المراسلة والمناظرة

کیا لامذہبیت امن وسکون کی ضامن ہے

(جناب شہاب الدین صاحب۔ عثمانیہ یونیورسٹی)

ماہ مئی کے نگار میں ایک صاحب کا مضمون ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے۔ "تاریخ کا منارہ، تمدن کا ستون، قوموں کی زندگی کا اہم اصول اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف مذہبی اصول ہیں"، آپ نے جو نوٹ لکھا ہے اس کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔

امن وسکون کے قیام کے لئے یہ ضروری ہے کہ بنی نوع انسان ایک خیالِ مشترک سے وابستہ ہوں ان کے اغراض ومقاصد باہمدگر متصادم نہونے پائیں۔ سامنے ایک منزل ہو اور ہر قدم اُٹھانے والا اُسی کو اپنا منتہائے مقصود تصور کرے۔ یہی ہے حاصل اتحاد اور اسی سے وہ یکجہتی اور خواہش عمل پیدا ہوتی ہے جو بقائے انسانیت کے لئے از حد ضروری ہے۔ پھر ذرا غور کیجئے کہ نفس انفرادی کے مقابل نفس اجتماعی پیدا کرنے کے جو ذرائع اختیار کئے گئے ان میں سب سے قوی ذریعہ کیا ہے؟ میرا خیال ہے کہ مرکزیت واتحادِ ملت کے قیام میں (جس کے بغیر امن وسکون ممکن نہیں) اور احساس انسانیت کو بیدار کرنے میں مذہب نے جسقدر حصہ لیا۔ اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی قوت نہیں کرسکتی۔ اب رہگئی قومیت سو بقول آپ کے "وہ بھی مذہب ہی کے اثرات باقیہ میں سے ہے" اس میں شک نہیں کہ مذہب کی تاریخ خوں آشامی کی ایک ہیبتناک داستان ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے صفحات اتحادِ خیال اور اتحادِ عمل کے ایسے عجیب وغریب مناظر پیش کرتے ہیں جن سے انکار کرنا گویا حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جس مقصد کے لئے مذہب کا قیام عمل میں آیا۔ اس کی تکمیل اس نے نہیں کی۔ اسمیں بھی

شبہ نہیں کہ دنیا سے افتراق و بدامنی، خونریزی و انسانیت شکنی کا خاتمہ ہو سکا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کونسا ذریعہ ہو سکتا ہے جو بنی نوع انسان کو ایک شیرازہ سے وابستہ کرے؟ یقیناً اس کا جواب آپ یہ دیں گے کہ "لامذہبیت" اور "لاقومیت" ہی وہ تنہا ذریعہ ہے جو انسانیت نواز ہو سکتا ہے۔ مگر خوف یہ ہے کہ یہ نظریہ جو اتنی وسعت اختیار کرلے کہ تمام انسانوں کو "ایک ہی کرہ کے رہنے والے اور ایک ہی مادرِ گیتی کے فرزند" ہونے کا یقین دلائے لیکن نظریہ کی حد تک ہی نہ رہے۔ جو اعتراض مذہب کے متعلق آپکا ہے وہی اس پر بھی عائد ہوتا ہے کہ اُصول کی حد تک "آپ پاکیزہ سے پاکیزہ جذباتِ انسانیت و اخوت لوگوں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں" مگر دُنیائے عمل میں ان کی حقیقت معلوم۔

آج کل روس "لامذہبیت" کا سب سے بڑا علمبردار ہے، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ روسی قوم اپنے مفاد کے آگے "ایک ہی سیارہ کے بسنے والوں" کے اغراض کو بالکل اسی طرح پامال نہ کرے گی جو تبعین مذہب کے کارناموں کا نمایاں پہلو ہے؟ اگر فطرتِ انسانی ہر جگہ ایک ہے تو پھر کیوں مذہب کو بدنام کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ شخص ثالث کی حیثیت سے جس طرح آپ مذہب پر تنقید فرماتے ہیں اسی طرح "لامذہبیت" سے بھی بے تعلق ہو کر اس کا جواب عنایت فرمائیں گے۔

(نگار) یہ آپ نے بالکل درست فرمایا کہ امن و سکون کے قیام کے لئے بنی نوع انسان کا کسی ایک خیال مشترک سے وابستہ ہونا ضروری ہے۔ اور اگر اسی اصول کو سامنے رکھکر آپ غور و تامل سے کام لیں تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ مذاہب عالم کبھی اس اُصول پر کاربند نہیں ہو سکے اور نہ یہ اُن کے حیطۂ اقتدار میں تھا۔

افسوس ہے کہ آپ نے "نفسِ اجتماعی" سے کسی خاص قوم یا مخصوص جماعت کا مفہوم مراد لیا ہے اور اسی لئے آپ فرماتے ہیں کہ مذہب نے اس کے قیام میں بڑا حصہ لیا ہے، لیکن اگر ہیئت اجتماعی میں تمام بنی نوع انسان کو شامل کرلیں (اور دنیا کے امن و سکون کے لئے ان کو شامل کرنا ضروری ہے) تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ مذہب نہ صرف یہ کہ اس باب میں ناکام رہا بلکہ بڑی حد تک برہمیِ سکون کا باعث ہوا۔

اگر دُنیا میں صرف ایک ہی مذہب رائج ہوتا تو بیشک آپ کا یہ دعوےٰ صحیح ہو سکتا تھا کہ اس نے وہ نفسِ اجتماعی پیدا کیا جو دنیا میں قیام امن و سکون کے لئے ضروری ہے، لیکن چونکہ ایسا نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا تھا اسلئے بجائے اس کے کہ تمام بنی نوعِ انسانی میں یکجہتی پیدا ہوتی، انہیں مذاہب کی وجہ سے باہم گراور اختلاف پیدا ہوا یہاں تک کہ دُنیا کا کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو مذہب کے نام پر روا نہ رکھا گیا ہو۔

آپ اس کے جواب میں ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو دنیا کا قصور ہے کہ وہ کیوں نہ مسلمان ہو کر ایک رشتہ سے وابستہ ہوگئی، لیکن آپ کا یہ اعتراض درست نہ ہوگا کیونکہ جس طرح آپ کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے، اسی طرح ایک عیسائی بھی کہہ سکتا ہے کہ دنیا نے کیوں نہ مسیحی مذہب اختیار کیا اور ایک ہندو بھی یہی کہنے کا حق رکھتا ہے اور ایک آتش پرست بھی۔ پھر اسکا فیصلہ کیونکر ہو کہ دُنیا اور اہل دُنیا کو کیا کرنا چاہئے تھا اور کس مذہب کا اختیار کرنا مناسب تھا۔

دین یا مذہب نام ہے ایک مخصوص اعتقاد و یقین کا جو کسی شخص کے دل میں پیدا ہو کر اس کے ضمیر کو مطمئن کر دے اور چونکہ یہ اطمینان بڑی حد تک ایک ملک کے آب و ہوا، اسکی جغرافی حالت، اور تمدنی و معاشری ضروریات سے وابستہ ہوتا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ وہ مذہب جو اہلِ مغرب کے زندگی یا حالات کے لحاظ سے ظہور میں آئے گا وہ مشرق والوں کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا، اور جو اہلِ شمال کے لئے مناسب ہوگا وہ جنوب کے باشندوں کے لئے قابل قبول نہ ہوگا۔ اگر آپ نے سامی مذاہب اور آرین مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے اور اس فرق کے پیدا ہونے کا خاص سبب یہی اختلافِ ذوق تھا جو ان دونوں قوموں میں پایا جاتا تھا اور چونکہ اختلافِ ذوق ہمیشہ نتیجہ ہوا کرتا ہے اختلافِ آب و ہوا، اختلافِ ماحول، اور اختلافِ جغرافی کا، اس لئے دنیا میں مختلف مذاہب کا پیدا ہونا ضروری تھا اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ تمام دُنیا کسی ایک مذہب کو اختیار کر کے تمام بنی نوع انسان کو کسی ایک مرکز سے وابستہ کر دے۔ الغرض مذہب کا خیال اصولاً و فطرتاً کوئی ایسا خیال نہیں ہے جو کرۂ ارض کے تمام باشندوں کو کسی ایک شیرازہ سے منسلک کر سکے اور اس لئے یہ قیاس کرنا کہ مذہب دنیا میں قیام امن و سکون کا باعث ہو سکتا ہے، بالکل قیاس مع الفارق ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ مذہب نے اتحادِ خیال و اتحادِ عمل کے ایسے ایسے مناظر پیش کئے ہیں جس سے انکار محال ہے بالکل درست ہے، لیکن کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اتحاد خیال و عمل کسی مخصوص جماعت یا مخصوص افراد سے آگے بڑھ سکا اور کیا اس اتحادِ خیال و عمل کی بنیاد دوسری قوموں اور جماعتوں کی تباہی و بربادی پر قائم نہیں رہی، پھر ایسا اتحاد و اجتماع یا ایسا نفسِ اجتماعی، دنیا کے کس کام آسکتا ہے اور وہ لوگ جو بنی نوع انسان کے تمام افراد کو ایک مرکز پر لانا چاہتے ہیں، اس سے کیا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

اب آپ کے استفسار کا دوسرا حصہ سامنے آتا ہے کہ اگر مذہب اس مقصد میں ناکام رہا تو اس کا دوسرا ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے اور اگر یہ ذریعہ "لامذہبیت" یا "لاقومیت" قرار دیا جائے تو اس کی کامیابی کی کیا ضمانت ہے اور کیا روس جو اس وقت "لامذہبیت" کا سب سے بڑا علمبردار ہے، دوسرے ملکوں کے اغراض کو بالکل اس طرح پامال نہ کرے گا جس طرح "مذہبیت" نے کیا۔

آپ کا یہ سوال یقیناً غور طلب ہے لیکن قبل اس کے کہ اس کا جواب دیا جائے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ "لامذہبیت" کا صحیح مفہوم کیا ہے ـــ مجھے علم نہیں کہ آپ نے اس کا کیا مفہوم قرار دیا ہے، لیکن میرے نزدیک اس کے دو پہلو ہیں۔

ایک وہ جس کا تعلق فلسفۂ مذہب یا معتقدات دینی سے ہے جس میں ایک قوم کی روایات بھی شامل ہیں اور دوسرا وہ جو سوسائٹی یا سماج سے متعلق ہے۔ پھر اب دیکھنا یہ ہے کہ مذاہب میں باہمد گر خونریزی کا سبب کونسا پہلو ہوا ہے، ظاہر ہے کہ اس کا سبب صرف معتقدات دینی تھے جن کی تبلیغ و ترویج نے سارا فساد برپا کیا اور اس کو محو کر دینے کا نام میں نے "لامذہبیت" قرار دیا ہے۔ یعنی اگر ایک شخص کا مذہب صرف اس کے ذاتی احساس و یقین تک محدود رہتا ہے اور وہ دوسرے کے اعتقاد کو مجروح نہیں کرتا تو ہمیں کوئی حق حاصل نہیں کہ اس کے خلاف گفتگو کریں لیکن اگر وہ سوسائٹی کے نظام کو درہم و برہم کر دینے والا ہے یا ہمارے حیاتِ اجتماعی کو ضرر پہونچانے والا ہے، تو یقیناً اسے محو ہو جانا چاہئے۔

روس کی "لامذہبیت" بجائے خود ایک ایسی سخت "مذہبیت" ہے کہ عام رواداری کے جذبات اس کے ماتحت بہت مشکل سے نشو و نما پا سکتے ہیں، درانحالیکہ "لامذہبیت" کا وہ مفہوم جو دنیا میں قیام امن کا باعث ہو سکتا ہے "مذہبی آزادی" یا "لاعصبیت" سے زیادہ نہیں۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ مذہب کے سماجی پہلو کو علی حالہٖ قائم رکھ کر اس کے معتقداتی پہلو کو تنگ کر کے صرف افراد تک محدود کر دیں اور تبلیغی سرگرمی کو یکقلم موقوف کرنے کی ضرورت ہے۔

آپ نے اگر نگار کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہوگا تو یہ حقیقت آپ سے مخفی نہ ہوگی کہ میں شروع سے مذہبی علماء کی مخالفت کر رہا ہوں اور اس کا سبب صرف یہی ہے کہ جب تک ان کا اقتدار قائم ہے، مذہبی تبلیغ برابر جاری رہیگی اور جس وقت تک یہ مشغلہ قائم ہے، فتنہ و فساد کبھی دور نہیں ہو سکتا۔

مسلمانوں کی یہ ذہنیت کہ جب ناقوس کی آواز کانوں میں آئے تو لاحول پڑھنے لگیں اور نماز کے وقت اگر گھنٹے یا باجہ کی صدا بلند ہو تو اُسے توہین اسلام قرار دیں، محض مولویوں کی پیدا کی ہوئی گمراہ ذہنیت ہے اسی طرح ہندوؤں کی یہ ذہنیت کہ اگر کسی مسلمان کو گائے کی قربانی کرتا ہوا دیکھ لیں تو اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آئے، یا اللہ اکبر کی آواز سُن لیں تو ان کا جذبۂ عناد مشتعل ہو جائے، اُن کے پنڈتوں کی پیدا کی ہوئی ذہنیت ہے اور اس کا سدّباب اس طرح ممکن ہے کہ ان قائدین مذہب کو فنا کر دیا جائے۔

میں جس "لامذہبیت" کا مؤید و حامی ہوں وہ روس کی لامذہبیت نہیں ہے جس میں خود نہایت سخت تعصب پایا جاتا ہے بلکہ وہ ایک ایسی مذہبی آزادی ہے جسے "لاعصبیت" کہنا زیادہ موزوں ہے اور اس کے پیدا کرنے کی صورت صرف یہی ہے کہ مولویوں اور مذہبی علمبرداروں کو فنا کر دیا جائے۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو جائیں تو مذہب کا خیال رفتہ رفتہ بالکل انفرادی و ذاتی حیثیت اختیار کر لیگا اور دُنیا کے ہیئت اجتماعی کو اس سے کوئی نقصان نہ پہونچے گا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ بہت دشوار ہے اور اس کا ردعمل لامحالہ وہی ہوگا جو آپ روس میں دیکھ رہے ہیں، کیونکہ اقتصادی مسایل کا حل بھی بڑی حد تک اس سے وابستہ ہے اور دُنیا جو روز بروز کسب معاش کی دشواریوں میں مبتلا ہو رہی ہے مجبور ہوگی بھوکا مارنے والے مفلس و قلاش بنانے والے مذہب کو ترک کر کے اس "لامذہبیت" کو اختیار کرے جو اور کچھ نہیں تو کم از کم فاقہ کی مصیبت کو دور کرنے والی ہے۔

باب الاستفسار

گھڑی سازی کی تاریخ

(جناب محمد اصغر علی صاحب - فرخ آباد)

میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ اپنے باب الاستفسار میں گھڑی سازی کے فن پر روشنی ڈالنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔ ابتداءً وقت کی تقسیم کی کیا صورت تھی اور رفتہ رفتہ اس میں کیا تدریجی ترقی ہوئی کہ موجودہ حالت تک پہونچ گئی۔

(**نگار**) گھڑیوں کی ایجاد سے قبل وقت کے تقسیم اجرام سماوی اور سایہ کو دیکھ کر کیا کرتے تھے، یعنی جب چاند اپنا چکر زمین کے گرد ختم کر لیتا تھا تو اسے مہینہ کہتے تھے اور جب زمین اپنا چکر سورج کے گرد پورا کر لیتی تھی تو اس کو سال سے تعبیر کرتے تھے اور دن سے مراد وہ وقت تھا جو زمین کو اپنے محور پر گردش کرنے میں صرف ہوتا تھا۔

اب رہ گئی اس سے بھی چھوٹی تقسیم گھنٹوں یا ساعتوں کی سو اس کے لئے وہ دن میں درختوں کے سایہ سے اور رات کو سیاروں کے رفتار سے مدد لیتے تھے۔ انسان نے کتنے عرصہ تک وقت کی تقسیم کا حساب اس طرح رکھا اس کی تعیین دشوار ہے، لیکن یہ یقینی ہے کہ سب سے پہلی گھڑی جو اختراع ہوئی وہ "دھوپ گھڑی" تھی اور بعض کا خیال ہے کہ انجیل کے "سفر ملوک ثانی" اور "سفر اشعیا" میں بہ سلسلۂ شفاء خرقیا ملک یہودا اس کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قبل مسیح ۷۰۰ سال دھوپ گھڑی کا رواج پایا جاتا تھا، اور ایسا ہو سکتا ہے کیونکہ کلدانی تہذیب زیادہ قدیم العہد تھی اور ممکن ہے دھوپ گھڑی وہاں سے منتقل ہوئی ہو۔

یونان کا فلسفی انکسیمندر، بیروسس کے دو سو سال بعد جب سرزمین کلدانیہ میں پہونچا ہے تو اس نے وہاں دھوپ گھڑی دیکھی اور وہیں سے وہ یونان لایا تھا جہاں بعد کو اس کا رواج عام ہو گیا۔ پھر اس دھوپ گھڑی کی صنعت میں

کس کس تفنن سے کام لیا گیا اس کا بیان دشوار ہے، ان میں سے بعض اتنی بڑی بنائی گئیں کہ بقول بعض اہرام مصری بھی اسی میں داخل ہیں اور جن کے سایہ سے تعیین وقت ہوا کرتی تھی اور بعض اتنی چھوٹی تیار کی گئیں کہ انگوٹھی میں نگینہ کا کام دیتی تھیں

لیکن چونکہ دھوپ گھڑی صرف دھوپ میں کام دے سکتی تھی اور ابر و باد کے موسم میں وہ بیکار تھی اس لئے لوگوں کا خیال پانی کی گھڑی کی طرف منتقل ہوا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ دو برتن لئے جاتے تھے ان میں سے ایک کے اندر پانی بھر دیا جاتا تھا اور اس کی پیندی میں باریک سوراخ ہوتا تھا جس سے پانی ٹپک کر دوسرے برتن میں جاتا تھا۔ اس برتن کے چاروں طرف متعدد خطوط نقوش ہوتے تھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ پانی کس خط تک پہونچا اور کتنا وقت گزر گیا بعد کو اس میں جدتیں بھی کی گئیں یعنی ایک یا ایک سے زائد پہیے استعمال کئے گئے جو پانی کے دباؤ سے گھومتے تھے اور ایک پہیہ میں سوئی لگا دی گئی جو پہیہ کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ گھومتی تھی اور وقت بتاتی تھی۔

پانی کی گھڑی کے موجد اہل مصر ہیں اور حسب بیان وٹرووس اسکندریہ کے ایک حجام نے ۲۴۵ سال قبل مسیح اسکو ایجاد کیا تھا۔ یہ خاص شخص اس کا موجد ہو یا نہ ہو لیکن یہ یقین ہے کہ پہیہ کا اضافہ اس نے کیا تھا۔ اس کے بعد جب افلاطون یونانی مصر میں آیا تو یہاں سے پانی کی گھڑی اپنے ساتھ یونان لے گیا اور وہاں خود اپنے ہاتھ سے ایسی گھڑی تیار کی جس میں ہر گھنٹہ ختم ہونے پر ستارہ بجتا تھا۔ ۱۵۷ سال قبل مسیح رومہ میں اس کا رواج ہوا، چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ پمپیوس جنگ کے موقعہ پر بھی اس گھڑی کو ساتھ رکھتا تھا جسمیں موتی جڑے ہوئے تھے۔ جولیس قیصر نے لکھا ہے کہ ۵۵ سال قبل مسیح انگلستان میں بھی اس نے یہ گھڑیاں دیکھی تھیں اور غالباً فنیقی تاجروں نے یہاں ان کو رواج دیا ہوگا۔

اہلِ عرب نے گھڑی سازی کے فن میں بڑی محنت و ذہانت سے کام لیا، چنانچہ وہ گھڑی جو ہارون الرشید نے ۸۰۷ء میں فرانس کے بادشاہ شارلمان پاس بھیجی تھی بہت مشہور تاریخی گھڑی سمجھی جاتی ہے۔ یہ بھی پانی کی گھڑی تھی، یہ تھی تو تانبہ کی لیکن اس پر طلا کا کام تھا، اس میں بارہ چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں تھیں جن میں سے چھوٹے چھوٹے معدنی گیند گر گر کر گھنٹا بجاتے تھے، جب اسکے بارہوں کھڑکیاں کھل جاتی تھیں تو ان میں سوار نکلتے تھے اور چاروں طرف چکر لگا کر پھر اندر داخل ہو جاتے تھے اور کھڑکیاں بند ہو جاتی تھیں۔

پانی کی گھڑی کے بہت زمانہ بعد "ریت گھڑی" ایجاد ہوئی، یعنی بجائے پانی کے ریت بھر دی جاتی تھی اور وہ سوراخ سے آہستہ آہستہ گرتی تھی، اس کے موجد بھی اہلِ مصر ہیں۔

انگلستان میں شمعوں کے ذریعہ سے تعیین اوقات کی جاتی تھی، روزانہ چھ شمعیں روشن کی جاتی تھیں جن میں سے ہر ایک بارہ انچ کی ہوتی تھی، ان شمعوں کے بدلنے اور اس کی بتی کاٹنے کے لئے دو راہب مقرر ہوتے تھے جو اپنی انگلیوں سے بتی کاٹتے تھے (قینچی کا رواج اسوقت تک نہ ہوا تھا) یہ شمعیں سینگ کے اندر روشن کی جاتی تھیں تاکہ ہوا سے گُل نہ ہوں، بعد کو فانوس کے اندر رکھ کر جلانے کا رواج پیدا ہوا

موجودہ پہیہ رکھنے والی گھڑیوں کے ایجاد کب ہوئی، یقین کے ساتھ بتانا مشکل ہے، بعض کہتے ہیں کہ قبل مسیح دو سو سال اسکی ایجاد ہوگئی، بعض کا خیال ہے کہ ۱۰۵ء میں ایک شخص بیھوس نے ایجاد کی، اور بعض کی تحقیق یہ ہے کہ ۸۵۵ء میں ایک راہب باسیوکوس نے اس کو اختراع کیا۔ ۹۹۶ء میں پاپائے اعظم سلوسٹر ثانی نے ایسی گھڑی بنائی جو پہیوں کے ثقل سے گھومتی تھی، چنانچہ لوگوں نے مشہور کر دیا کہ پاپا سحر جانتا ہے اور جادو کے مدد سے اس نے یہ گھڑی بنائی ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی تک اس صنعت میں کافی ترقی ہوگئی چنانچہ اہل عرب نے بعض ایسی گھڑیاں طیار کر کے خلفاء مصر کے سامنے پیش کیں جو نہایت مکمل تھیں۔ یہی گھڑیاں بعد کو فریڈرک ثانی کے پاس پہونچیں اور اسی وقت سے اطالیہ میں پہیہ والی گھڑیاں بننی شروع ہوئیں جس کا تتبع انگلستان میں بھی کیا گیا۔ چنانچہ اڈورڈ اول کے زمانہ میں کسی راہب نے جو لوہار کا لڑکا تھا ایسی گھڑیاں طیار کیں جو گھنٹوں کے علاوہ شمس و قمر کی گردش اور اوقات مد و جزر کو بھی بتاتی تھیں۔ اس کے بعد ۱۳۲۵ء میں ایک اور راہب نے ایسی گھڑی بنائی جو سیاروں کی گردش کو بھی بتاتی تھی۔ اس میں دو پتلے نصب تھے جو گھنٹہ بجاتے تھے اور اوپر آٹھ پتلے پہلوانوں کے تھے جو آپس میں زور آزمائی کرتے تھے، کہا جاتا ہے کہ یہ گھڑی اب بھی موجود ہے اور کام دیتی ہے۔

۱۳۴۴ء میں وینس کے ایک آدمی نے ایسی گھڑی بنائی جو صرف شمس و قمر اور سیاروں کی حرکات کو ظاہر کرتی تھی بلکہ سال کے تمام تہواروں کو بھی بتاتی تھی۔

گھڑی میں پنڈولم یا رقاص کا استعمال سترھویں صدی عیسوی سے ہوا ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس کے موجد اہل عرب ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ وہ کوئی فرنگی تھا، لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس کے موجد اہل عرب تھے لیکن ترقی دی اسکو اہل فرنگ نے۔ ۱۸۸۰ء میں نیویارک کے ایک شخص نے ایسی گھڑی بنائی جو ۱۸ فٹ لمبی، ۸ فٹ چوڑی اور ۵ فٹ دبیز تھی۔ اس میں دو ہزار پہیے تھے۔ اس کے اوپر واشنگٹن کا مجسمہ بنایا گیا تھا اور بہت سے دوسرے مجسمے ایسے تھے جو علاوہ وقت کے گردش شمس و قمر اور رصد جانے کیا کیا ظاہر کرتے تھے۔

موجودہ ساخت کی جیبی گھڑی بیضاوی شکل کی سب سے پہلے ۱۴۹۰ء میں طیار ہوئی اور ایک شخص پیٹرس ہیلی نے اسے طیار کیا تھا۔ اس قسم کی گھڑیوں میں صرف ایک سوئی ہوتی تھی جو دن میں دو یا تین مرتبہ گردش کرتی تھی۔ اور چونکہ یہ بھاری بہت ہوتی تھیں اس لئے گردن میں موٹی زنجیر سے باندھ کر لٹکائی جاتی تھیں۔

چونکہ یہ گھڑیاں بہت قیمتی ہوتی تھیں اس لئے سوائے بادشاہوں اور امراء کے دوسرے استعمال نہ کر سکتے تھے، سترھویں صدی میں کمانی ایجاد ہوئی اور جیبی گھڑیاں زیادہ مکمل بننے لگیں۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اب جتنی ترقی ہوئی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ سب سے زیادہ مکمل گھڑیاں وہ ہیں جو کرونوگراف یا کرونومیٹر کہلاتی ہیں اور رصدگاہوں میں استعمال ہوتی ہیں۔

انتباہ!

اے روشِ نا آشنا، گم گشتۂ راہِ حیات
آ، بتاؤں تجھ کو رمزِ زندگی وجہِ ممات

دل ترا احساس کی لذت سے ہے نا آشنا
راہِ آزادی میں واماندہ ہے تیرا حوصلہ

مشکلاتِ وقت سے تو جنگ کر سکتا نہیں
تو غلامی کے اندھیرے سے اُبھر سکتا نہیں

ہے یہاں ہر پھول کے پردے میں پنہاں خار زار
آستیں کے سانپ ہیں یہ تیرے سارے غمگسار

اپنے مستقبل کی اپنے ہاتھ سے تعمیر کر
بیٹھ جا اقبال کے سینے میں پہلو چیر کر

جب رگِ انسانیت میں عزم کرتا ہے گزر
شوق آتا ہے نکل، دیوارِ آہن توڑ کر

خون میں جب آتشِ احساس ہوتی ہے رواں
سانس سے بن بن کے انگارے نکلتا ہے دھواں

جذبۂ آزاد جب ہوتا ہے دل میں موجزن
شیر کے پنجے میں بھی ہرگز نہیں رکتا ہرن

اور جب بیچارگی کرتی ہے عزمِ احتجاج
سر پہ اک مزدور کے سلطان کا ہوتا ہے تاج

محمد صادق ضیا

ہمارے قائدین ملت

غم و آلام سے خالی ہے پیشہ رہنمائی کا
نکموں کے لئے اچھا ہے پیشہ رہنمائی کا

چراغِ معصیت سے خلوتیں جن کی فروزاں ہیں
عصائے رہنمائی سے فروغِ بزمِ ایماں ہیں

عطا ہوتا ہے اک دو ماہ میں تمغہ شرافت کا
نہ کیونکر ہر بزو مایہ کو سودا ہو قیادت کا

درخشاں ہیں گلے ہاروں سے مانندِ عروس انکے
نہایت شان و شوکت سے نکلتے ہیں جلوس انکے

بہت ہے اپنی مفلس قوم کے پیسے کا پاس ان کو
سفر کے واسطے مطلوب ہے سیکنڈ کلاس ان کو

نہ راجاؤں سے ڈرتے ہیں نہ دبتے ہیں حکومت سے
بسر ہوتی ہے چند دن کی بدولت شان و شوکت سے

نہایت قابلِ نفرت ہیں افعالِ زبوں ان کے
ہوئے ہیں قوم کا خوں پی کے چہرے لالہ گوں ان کے

مہاجن بن رہے ہیں گوشت مفلس قوم کا کھا کر
یہ بندے نفس کے مسرور ہیں احرار کہلا کر

حکومت پھانسی سے اور جیل کی سختی سے ڈرتے ہیں
شکوہِ قوم سے حکام کو مرعوب کرتے ہیں

سفارش سے گزارش سے علالت کے بہانے سے
نکل آتے ہیں دولھن بن کے اکثر جیل خانے سے

اگر چلتا نہیں اہلِ حکومت پر کوئی افسوں
رقم کرتے ہیں بیکس قوم کو اک نامۂ پر خوں

کسی صورت سے حاصل جیل میں ہوئے کلاس انکو
نہ کرنے پائیں تنہائی کی راتیں بھی اوداس ان کو

یہ حالت ہے تو زنداں سے کوئی گھبرائے کیا معنی
کسی ظالم کے ظلم و جور سے ڈر جائے کیا معنی

ہوا محشر بپا نعروں سے گردوں کی فضاؤں میں
مگر سولہ برس میں کیا کیا ان رہنماؤں نے

دیارِ ہند میں ہے ملتِ بیضا غلام اب تک
یہ حریت کی طالب دم بخود ہے زیرِ دام اب تک

گلا اس سخت جاں کا ہے عدو کی تیغِ براں ہے
مسلماں کا لہو اب تک مثالِ آب ارزاں ہے

وہی پستی وہی نکبت وہی ذلت وہی خواری
وہی مستی وہی غفلت وہی خوابِ گراں طاری

رہینِ انتظارِ ناخدا یہ قوم ہے اب تک
یم تعلیم سے ناآشنا یہ قوم ہے اب تک

نہ ہے کوئی نصاب اس کا نہ ہے کوئی نظام اس کا
نہ کوئی مدعا اس کا نہ کوئی اہتمام اس کا

جو دیکھو رہنماؤں کو تو اک اک شیر صحرا ہے
کوئی ہٹلر بنا پھرتا ہے کوئی ڈی ویلرا ہے

جو کیجے امتحاں تو نفسِ آمارہ کے بندے ہیں
کلام حشر زا کے دام ہیں چندوں کے پھندے ہیں

کوئی مسجد بنے سیلاب آئے زلزلہ آئے
نکل آتے ہیں چندے کے لئے دامن کو پھیلائے

ہر اک بستی ہر اک قریہ میں مولانوں کا پھندہ ہے
کسی تحریک کو لے لیجے مقصد "صرف چندہ" ہے

پشاور سے اگر رنگون تک پھیلی ہے آگ ان کی
کراچی سے اگر کشمیر تک ہے دوڑ بھاگ ان کی

تعلق کیا ہے اس کا ملتِ بیضا کی خدمت سے
مسلمانوں کو کیا ملتا ہے اس سیر و سیاحت سے

سُن اے مردِ جری! اے خالد و فاروق کے پوتے
ضرورت کیا ہے لیڈر کی تجھے قرآن کے ہوتے

ضرورت ہے کہ اب تو ان ستمرانوں کو پہچانے
لئے جاتے ہیں دوزخ کی طرف تجھکو یہ مولانے

نہ ہو مرعوب ان کی آتشیں تقریر سے غافل
نہ ہو دم بھر بھی ان کے نعرۂ تکبیر سے غافل

یہ آزادی کے دعوے بے خبر باتیں ہی باتیں ہیں
متاعِ دین و ایماں لوٹنے والوں کی گھاتیں ہیں

ترے ہمدرد بن کر تیرے خوں سے پیٹ بھرتے ہیں
تری خدمت کے پردہ میں حکومت تجھ پہ کرتے ہیں

اصغر حسین خاں نظیر لودھیانہ

تذکرہ معرکۂ سخن شائع ہوگیا

یہ تذکرہ اُردو زبان میں اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ ہے جس میں زمانۂ قدیم سے لیکر موجودہ عہد تک کے تمام مشہور شعراء فارسی و اردو (مثلاً آتش، آرزو، آزاد بلگرامی، احسن مارہروی، اصغر گونڈوی، ڈاکٹر اقبال، امیر، انیس، بیدل، بیخود، ثاقب، جگر، حزیں، میر حسن، حفیظ جالندھری، خواجہ کرمانی، داغ، دبیر، ذوق، ریاض، سنجر کاشانی، سلمان ساوجی، سودا، شرر، شوکت بخاری، صائب، صبا، مصحفی، عالی شیرازی، عرفی، عزیز لکھنوی، نعمت خان عالی، غالب، فیض، میر و ناسخ وغیرہ وغیرہ) کے کلام پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں معہ جواب و محاکمہ یکجا کر دئے گئے ہیں فن شعر و انشاء کے شائقین کے لئے عجیب چیز ہے۔
نگار سائز کے ۲۸۸ صفحات پر نفیس طباعت و کتابت کے ساتھ دبیز کاغذ پر شائع ہوا ہے۔ قیمت معہ محصول عہ

منیجر نگار لکھنؤ

انتخاب از کلامِ محروم

(مرسلۂ عدم)

اسیرانِ قفس کی اے چمن والو خبر لینا
بہار آئے تو ان بھولے ہوؤں کو یاد کر لینا
دلِ نازک ترا اس سے نہ اے صیاد ہو برہم
مری عادت میں داخل ہے کبھی فریاد کر لینا

ترا نام تسکینِ دہِ قلبِ مضطر
تری یاد آرامِ جانِ حزیں ہے

کھُل سکے اُن پہ کس طرح واقفِ سوز و ساز ہوں
چاہئے اب کہ شمع ساں میں بھی زباں دراز ہوں

اک اضطرابِ پیہم پہلے تھا اب سکوں ہے
وہ غم کی ابتدا تھی، یہ غم کی انتہا ہے ✓

اہلِ ہوا نہیں ہیں فقط آج غم نصیب
روزِ ازل سے جام نگوں ہے حباب کا
محروم کچھ برا نہ ہوا جا چکا اگر
تھا دورِ غفلتوں کا زمانہ شباب کا

جو وہ غمخوار ہو جائے تو غم کیا
زمانہ کیا۔ زمانہ کے ستم کیا

دلِ ناداں کی بدولت ہے جو رسوائی ہے
بد دعا اور اسے کیا دوں کہ یہ ناکام تو ہے ✓

حسرتِ خفتہ کو جگاتا ہے
ذکر پیری میں نوجوانی کا

ذراتِ خاک بن نہیں جاتے نجوم کیوں
حیرت سے دیکھتا ہوں تری رہگزر کو میں۔

طبیعت مائلِ ذوقِ جفا معلوم ہوتی ہے　　کہ اُن کی بے وفائی بھی وفا معلوم ہوتی ہے

سفر کرتے ہوئے منزل بمنزل جا رہے ہیں ہم　　مجھے یہ ساری دُنیا کارواں معلوم ہوتی ہے

یوں پشیماں ہوں میں غفلت میں جوانی کاٹ کر　　جس طرح دن بھر پشیماں ہو پشیمانِ سحر
حُسن یہ سارا اُسی کا ہے کہ جس کے عشق میں　　چاک روزِ ابتدا سے ہے گریبانِ سحر
سوئے در کیا دیکھتا ہے۔ اے دلِ غمدیدہ دیکھ　　یہ شبِ فرقت ہے جس میں کم ہے امکانِ سحر

فتنہ آرا شورشِ اُمید ہے میرے لئے　　نا اُمیدی راحتِ جاوید ہے میرے لئے

گزرتی جا رہی ہے زندگی اور روح شاداں ہے　　مسافر کے لئے کم تر مسافت ہوتی جاتی ہے

محروم

رقص

دل کی وہ گہرائیاں، جذبات کے وہ ولولے　　ترجمانی جن کی ناممکن ہو یکسر، نطق سے
روپ بھر لیتے ہیں اعضا کی لچک کا ہمنشیں　　رقص میں عریاں نظر آتی ہے دِل کی سرزمیں
مرمریں اعضا میں ہوتا ہے بہاروں کا ہجوم　　پھول کھلتے ہیں نگاہوں میں، لرزتے ہیں نجوم
دِل کے ہر ذرے کا سوز و ساز ہوتا ہی عیاں　　روح کے اعماق کا ہر راز ہوتا ہے عیاں
دل کی ہر پہلو سے پوری ترجمانی رقص ہے　　رعشۂ اعضا سے تخلیقِ معانی رقص ہے

عدم

جنوری سنہ ۳۵ء کیلئے

حسب ذیل عنوانات پر مقالے درکار ہیں

(۱) دہلی اور لکھنؤ اسکول کی شاعری پر مؤرخانہ نظر اور انکی خصوصیات

(۲) دونوں اسکولوں کے اکابر اور ان کا فرق مدارج

(۳) فن اور زبان کی حیثیت سے دونوں کا مرتبہ

(۴) لکھنؤ اسکول پر دہلی کا اثر

(۵) دہلی اسکول پر لکھنؤ کا اثر

(۶) دونوں اسکولوں کی غزلگوئی پر تفصیلی تبصرہ

(۷) لکھنؤ اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰، ۲۰ شعر

(۸) دہلی اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰، ۲۰ شعر

(۹) منظوم افسانے یا مثنوی لکھنؤ اسکول میں

(۱۰) منظوم افسانے یا مثنوی دہلی اسکول میں

(۱۱) دکن اور اردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)

(۱۲) پنجاب اور اردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)

(۱۳) تذکرہ نگاری کی حیثیت سے لکھنؤ اور دہلی کے خدمات

(۱۴) دونوں اسکولوں کے کارنامے، رباعیات مرثیہ، قصیدہ و نعتیں

(۱۵) دولت مغلیہ کے انحطاط کا اثر دہلی کی شاعری پر

(۱۶) شاہان اودھ اور لکھنوی شاعری

(۱۷) دہلی اور لکھنوی شاعری میں اخلاقی و مذہبی عنصر

(۱۸) شاعری کے لحاظ سے لکھنؤ کا دورِ زریں

(۱۹) شاعری کے لحاظ سے دہلی کا دورِ زریں

(۲۰) لکھنؤ اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے دہلی کا تتبع کیا

(۲۱) دہلی اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے لکھنؤ کا تتبع کیا

(۲۲) لکھنؤ اور دہلی کے وہ شعراء جنھوں نے ملک و قوم کو کوئی خاص پیغام پہنچایا

(۲۳) کیا دہلی اسکول روبہ انحطاط ہے؟ اور کیوں

(۲۴) کیا لکھنؤ اسکول روبہ انحطاط ہے؟ اور کیوں

(۲۵) رامپور کا تعلق دہلی اور لکھنؤ اسکولوں سے

(۲۶) حیدر آباد اور لکھنؤ و دہلی اسکول کا اس سے تعلق

(۲۷) کیا لکھنؤ اسکول نے کلکتہ میں بھی شاعری کو متاثر کیا؟

(۲۸) کیا لکھنؤ اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو کیا

(۲۹) کیا دہلی اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو کیا

(۳۰) مستقبل میں آپ کو اردو شاعری سے کیا توقعات ہیں؟

(۳۱) دونوں اسکولوں کے وہ شعراء جنھوں نے قدامت کو ترک کرکے کسی ابداع و اختراع سے کام لیا

(۳۲) لکھنؤ اور دہلی کے ریختی اور ہزل گو

(۳۳) لکھنؤ اور دہلی کی خواتین جنھوں نے شاعری میں نمایاں حصّہ لیا

(۳۴) لکھنؤ اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر

(۳۵) دہلی اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر

(۳۶) آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق

نوٹ:۔ لکھنؤ اور دہلی کی شاعری سے مراد وہ تمام شعراء ہیں جو یہاں کی شاعری سے متاثر ہو کر اسی رنگ میں شعر کہتے ہیں۔ اس کے لئے کسی خاص جگہ کا باشندہ ہونے کی شرط نہیں ہے۔

مُفت

ہمایوں کا بے نظیر افسانہ نمبر

یکم اگست سنہ ۳۴ع کو ہمایوں کا افسانہ نمبر شائع ہو رہا ہے۔ یہ پرچہ اپنی مثال آپ ہوگا۔ ہندوستان میں آج تک افسانوں کی کسی بہتر سے بہتر کتاب میں بھی ایسے مسحور کن دلآویز اور فن کے لحاظ سے بلند معیار افسانے شائع نہیں ہوئے۔ یہ رسالہ نہیں۔ مستقل حیثیت کی ایک بدیع امثال ادبی تالیف ہوگی۔ ضخامت ہمایوں کے سائز کے تقریباً نوے صفحات کتابت۔ طباعت اور کاغذ نفیس۔ رنگین تصویر۔ خوبصورت سرورق۔

پانچ روپیہ چھ آنہ مع محصول ڈاک سالانہ چندہ دے کر آپ سال بھر کے پرچوں کے ساتھ افسانہ نمبر اور جنوری سنہ ۳۵ع کا ضخیم سالگرہ نمبر مفت حاصل کر سکتے ہیں۔ تین روپے ششماہی چندہ ادا کر کے بھی آپ ان دونوں رعائتوں کے مستحق ہو سکتے ہیں۔

ملنے کا پتہ

منیجر "ہمایوں" ۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور